وارث شاہ

(زندگی اور زمانہ)



لوک ورثہ اشاعت گھر، اسلام آباد

وارث شاہ

(زندگی اور زمانہ)

تحریر و تحقیق

شریف کنجاہی
سجاد حیدر
محمد آصف خان

لوک ورثہ اسلام آباد

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

ناشر : عکسی مفتی۔ صفدر حسین

معاون : سیّد محمد علی

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۱۵۰/- روپے

مشترکہ اشاعت : لوک ورثہ اشاعت گھر، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۸۴ - اسلام آباد

الحمد پبلی کیشنز، چوک پرانی انارکلی، لاہور

فہرست

عرض حال

پنجابی زبان میں سوانح نگاری ایک تازہ صنف ادب ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی دوسری بڑی زبانوں میں بھی سوانحی ادب یا تو بادشاہوں اور حکمرانوں کے کارناموں کی وقائع نگاری پر مشتمل رہا ہے' یا پھر دینی اور روحانی سلسلوں کے بزرگوں کی سیرت نگاری اور ملفوظات پر مشتمل رہا ہے۔ ہمارے ہاں بڑے سے بڑا شاعر اور ادیب بھی کسی سوانح نگار کی تصنیف کا موضوع نہیں بن سکا۔ البتہ اس کے فن پر تبصرہ کیا جاتا رہا ہے اور یوں تذکروں میں اپنے تخلیقی عمل کے حوالے سے اس کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ شاعر اور ادیب کی ذات سے اس بے تعلقی کی فضا میں آنے والے زمانوں کے قاری کو اگر اس کے حالات کی خبر کہیں سے ملتی ہے تو خود اس شاعر اور ادیب ہی کے واسطے سے ملتی ہے' کیونکہ ہر بڑا شاعر اور ادیب اپنی ادبی تخلیقات میں حسب موقعہ کچھ ایسے اشارے چھوڑ جاتا ہے جو جستجو کرنے والے قاری کو اس کے ذاتی حالات تک لے جاتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں پنجابی ادب کے معروف ترین شاعر سید وارث شاہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ آج ان کی وفات کو دو سو برس کا عرصہ ہو رہا ہے لیکن ان کے فن شاعری کے بارے میں میاں محمد بخش کے چند توصیفی اشعار مولوی احمد یار کی سخن وارث اور میاں مولا بخش کشتہ کے "پنجابی شاعراں دا تذکرہ" میں اجمالاً ان کے ذکر اور عبدالغفور قریشی کی کتاب "پنجابی ادب دی کہانی" میں تذکرے کے علاوہ پنجابی ادب کے قدیم ورثے میں اس عدیم المثال سخن ور کی ذات کے حوالے سے قاری کو کوئی آگاہی نہیں ہوتی۔ البتہ اس صدی کے ربع ثانی میں چند ادبی

کاوشیں اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلے مجلس احرار کے راہنما چوہدری افضل حق نے اپنی کتاب "معشوقہ پنجاب" میں وارث شاہ کی زندگی کا احوال بیان کیا۔ پھر ۱۹۳۵ء میں پروفیسر ضیا محمد کی کتاب "یادگار وارث" چھپی، جس میں وارث شاہ کے حالات زندگی تحریر کیے گئے۔ ۱۹۸۱ء میں عذرا وقار کی تصنیف "وارث شاہ عہد اور شاعری" چھپ کر سامنے آئی اور قارئین کو سید وارث شاہ کے بارے میں کچھ مزید معلومات فراہم ہوئیں۔

اس سلسلے میں لوک ورثہ نے قدم آگے بڑھایا اور وارث شاہ کے حالات زندگی اور زمانہ سے متعلق ایک تحقیقی اور مستند کتاب مرتب کرنے کے لئے پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور کے تعاون سے پنجابی کے معروف ریسرچ اسکالرز پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں پنجابی ادب کے نامور محقق پروفیسر شریف کنجاہی، بورڈ کے سیکریٹری محمد آصف خان اور مجھے شامل کیا گیا اور "وارث شاہ، زندگی اور زمانہ" پراجیکٹ شروع کیا۔ کمیٹی کے ارکان نے چھ ماہ کی عرق ریز تحقیق اور فیلڈ ورک کے بعد اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ترتیب دی ہے جس میں ۱۔ وارثی عہد اور پنجاب ۲۔ وارثی عہد کے ماخذ ۳۔ وارث کا اتہ پتہ، ۴۔ وارث شاہ وسنیک جنڈیالڑے دا، ۵۔ شاگرد مخدوم قصوردا اے، ٦۔ کھرل ہانس دے ملک مشہور ملکہ، ۷۔ وارث اپنے آئینہ گفتار میں، ۸۔ بھاگ بھری اور وارث، ۹۔ وارث شاہ اور فحش گوئی، ۱۰۔ وارث شاہ کے معتقدات، ۱۱۔ وارث شاہ کی دوسری تصانیف، ۱۲۔ ہیر وراث شاہ میں مذکورہ بعض مقامات، ۱۳۔ نقشہ جات وغیرہ شامل ہیں۔

اس بورڈ نے مواخذ کی تلاش میں جہاں سید وارث شاہ کی تصنیفات میں سوانحی اشاروں کا عمیق نظر سے جائزہ لیا، وہاں اس قادرالکلام شاعر کی زندگی کے

بارے میں مختلف مضامین و مقالات میں تحریر کی گئی زبانی روایات (Oral Tradition) کو بھی تحقیق کے ترازو پر تولا، اور مقامی شہادتوں کو دوسری مستند گواہیوں سے ملا کر نتائج اخذ کیے۔ اس سلسلے میں سید وارث شاہ کے کنبے سے حاصل کردہ دستاویزات اور محکمہ مال کے پرانے ریکارڈ میں اندراجات سے بھی مدد حاصل کی گئی۔ بورڈ کے اراکین ان تمام مقامات پر بھی گئے، جہاں سید وارث شاہ نے اپنی زندگی میں قیام کیا اور وہ ساری جگہیں دیکھیں جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی، روحانی فیض حاصل کیا تھا یا تصنیف کے کام میں وقت گزارا تھا۔ اس تحقیق کے دوران ان محققین نے بہت سے مخطوطات بھی ملاحظہ کیے۔

اس کتاب میں تحقیق کے ان تمام قابل ذکر نکات کا احاطہ کیا گیا ہے جو اس مرحلے تک سید وارث شاہ کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر نئے حقائق کی روشنی میں ان نکات کو رد یا قبول کیا گیا ہے۔ یوں اس تصنیف کی حیثیت کا بھی اندازہ ہوتا رہے گا۔ تحقیق کے مسلسل عمل میں کسی بات کو حرف آخر کا مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، اس لیے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس تحقیقی منصوبے کے نتائج آنے والے زمانہ کے کسی محقق کو تحقیق کی نئی راہوں پر ڈال دیں۔ وارث شاہ کی اپنی کسی خود نوشت سوانحی تحریر یا ان کے معاصرین کی ان کے ذاتی حالات کے بارے میں کسی دستاویز کے عدم وجود نے مواخذ کے سوتے خشک کر رکھے ہیں۔

لیکن اس خود آگاہ اور جہاں بین شاعر نے اپنے کلام میں جس طرح خود اپنے اور اپنے زمانے کے حالات کی طرف لطیف مگر واضح اشارے کیے ہیں، ان کی مدد سے رمز آشنا محققین نے اس آزاد مرد کی زندگی کے کئی تاریک گوشوں تک راہ پائی۔ اس حوالے سے بلا کم و کاست کہا جاسکتا ہے کہ اندریں حالات وارث کی شہرہ

آفاق تصنیف ہیر اپنے مصنف کی زندگی کی تفصیلات جاننے کے لئے بہترین Source Material ہے۔

سید وارث شاہ کے زمانے کا پنجاب، جو طوائف الملوکی اور بیرونی حملوں کا شکار تھا، تاریخ کے اوراق میں بکھرا پڑا ہے۔ ان اوراق پریشاں کو مجتمع کرنا اس عہد کی مجموعی تصویر دکھانے کے لئے ضروری تھا، لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ عمل تھا کہ مغل، سکھ اور انگریزی دور کے تاریخ نویسوں نے اس عہد کے اہم واقعات اور شخصیات کی صورتوں کو تعصب کے ہاتھوں جہاں جہاں بگاڑ کر دکھایا ہے، وہاں وقت کی گرد جھاڑ کر انہیں حقیقت کی روشنی میں ان کی اصلی حالت میں دکھایا جائے۔ اس کوشش میں اگر آج کی فضا نے تاریخی وقائع نگاری کو متاثر کیا ہے تو اسے روح عصر سے اثر پذیری کہا جا سکتا ہے، جس پر صرف عہد فردا کا کوئی غیر جانبدار تاریخ نویس ہی حکم لگا سکتا ہے۔ آج کے قاری کے لیے تو پنجاب کی گزشتہ تاریخ کا چہرہ دھو کر صاف کر دیا گیا ہے اور غیر حقیقی داستانوں سے اس کا دامن پاک کر دیا گیا ہے۔ اس عمل میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ تمام واقعات و شخصیات کو اسی نظر سے دکھایا جائے، جس نظر سے پنجاب نے انہیں دیکھا ہے۔

سجاد حیدر

ابتدائیہ

طباعت اور اشاعت کی آسانیوں کے اس دور میں تعلیم و تدریس کی آسانیوں کے ساتھ ساتھ یہ اضطراب اور تحیر بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ ماضی کی وہ شخصیتیں جن کے بارے میں ہم آج زیادہ سے زیادہ جاننا اور پڑھنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کے لئے ایسے حوالے نہیں چھوڑ گئیں جو ہماری تشنہ کامی کا مداوا بن سکیں۔ بعض اوقات ان کے معاصرین بلکہ قریبی متاخرین نے بھی ایسا کوئی مفید قدم نہیں اٹھایا ہوتا اور جب وقت زیادہ گزر جاتا ہے تو ٹامک ٹوئیاں ہی مقدر بنتی ہیں۔ پنجاب کے معروف ترین اور مقبول ترین شاعر وارث شاہ کا مسئلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے اور گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی اس کی تخلیق یعنی ہیر رانجھا کی داستان محبت ہی سے رہی ہے اس کے حالات سے نہیں رہی۔ چنانچہ ہمارے پنجابی کے مشہور شاعر ہدایت اللہ نے بھی جن کی تاریخ پیدائش ۱۸۳۸ء بتائی جاتی ہے یعنی وارث شاہ کی تصنیف ہیر سے ۴۷ سال بعد جنڈیالے جاکر اگر مزار وارث پر بیٹھ کر چلہ کاٹا تو بھی اس کا نتیجہ اسی قدر نکلا کہ اصل اشعار کے ساتھ کچھ اشعار اپنی طرف سے ملانے کی گویا اجازت حاصل کر لی گئی ورنہ اس دور میں ایسے لوگ ضرور موجود ہوں گے جنہوں نے اگر خود نہیں تو ان کے والدین نے وارث شاہ کو دیکھا سنا ہوگا۔ یہی صورت میاں پیراں دتہ ترگڑ کی ہے جس نے ۱۹۱۰ء میں میاں ہدایت اللہ کے بعد (لیکن موصوف کی زندگی ہی میں کہ میاں ہدایت اللہ نے ۱۹۲۹ء میں وفات پائی) جنڈیالے کا قصد کیا اور وہاں سے "لکھیا خاص مصنف دا اک نسخہ" حاصل کیا۔ کیوں؟ تاکہ ہیر وارث شاہ کو مزید فربہ اقدام کیاجائے اور یہی روش عام رہی۔

بعد میں جب معروف معنوں میں ارباب بصیرت و دانش نے ادھر توجہ کی تو

بھی سب کے پیش نظر ہیر ہی رہی اور اب اس فکر کے ساتھ کہ ملاوٹ یا اضافے کا جو رواج چل گیا ہے اسے کسی طرح روکا جائے اور وارث کے اصل کلام کو الگ اور محفوظ کیا جائے۔ شاعر چونکہ کسی کے لئے اہم نہیں تھا اس لئے کسی نے بھی اس کے حالات جاننے کی طرف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ بس ایک نے کہی دوسرے نے مانی سکہ رائج الوقت رہا بلکہ ابھی کل تک چلا آرہا تھا کہ ۱۹۳۵ء میں پہلی بار (اور وہ بھی اردو میں) یادگار وارث کے نام سے ایک کتاب سامنے آگئی۔ اس کے مصنف پروفیسر ضیا محمد صاحب (قلعہ داری) تھے لیکن پتن سے پانی اتنا آگے نکل چکا تھا کہ ان کو اس اعتراف کے ساتھ کتاب کو آغاز کرنا پڑا۔

"پنجاب کے دیہات میں ہیر وارث کے پڑھنے اور سننے کا بڑا چرچا ہے۔ اضلاع لاہور، شیخوپورہ، گجرانوالہ، گجرات، لائل پور، جھنگ وغیرہ خصوصیت سے اس بارے میں مشہور ہیں۔ ہیر کی شہرت اور مقبولیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ قریباً" پونے دو سو سال سے ہر زمانہ میں اس کتاب کے حافظ ہوتے آئے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں۔ ہیر کے تین زندہ حافظوں سے تو مصنف یادگار وارث بھی واقف ہے۔ ان میں سے سائیں نقد گجرانوالیہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

دیہاتی لوگ ہیر کے قاریوں (پڑھنے والوں) کو دعوتیں بھیج کر بلاتے ہیں جو اکثر شوق سے اس کتاب کو پڑھتے ہیں ان کی خوش نوائی سے دوسرے لوگ لطف اٹھاتے ہیں۔ بعض سر دھنتے ہیں۔ بعض پر وجد تک کی حالت طاری ہوجاتی ہے۔ وارث کے اشعار پر لطیف بحث و تمحیص ہوتی ہے۔ ان کی تشریح و توضیح کی جاتی ہے۔

چونکہ موسم گرما کی چھٹیاں مجھ کو متواتر کئی سال اپنے گاؤں میں گزارنے کا

اتفاق ہوا۔ لہٰذا ایسی مجلسوں میں چند دفعہ ہیر سننے کا موقع ملا۔ وارث کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف اور ہیر کے ناصحانہ پہلوؤں کا خیال پیدا ہوا جستہ جستہ مقامات سے جب خود مطالعہ کیا تو اس کی ادبی حیثیت اور وارث کی شاعرانہ قابلیت کا حسن ظن اور بھی بڑھا۔ حتیٰ کہ مستقل ارادہ ہوا کہ وارث یا اس کی ہیر پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے۔

چنانچہ اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر "یادگار وارث" کے لئے مواد جمع کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ احباب سے استصواب کیا۔ اکثروں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ بعض نے دور حاضرہ کے پنجابی زبان کے ادیبوں اور مصنفوں کے نام لئے مثلاً" چوہدری سر شہاب الدین و خان صاحب قاضی فضل حق، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، پروفیسر آئی سی نندا وغیرہ۔ ان حضرات سے استفادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

۱۔ خان بہادر چوہدری شہاب الدین صاحب صدر لیجسلیٹو کونسل پنجاب سے تو میرا کوئی تعارف نہ تھا۔ ان کی بیشمار ضروری مصروفیتوں کے باعث ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے کچھ تردد رہا۔ اگرچہ اکثر احباب سے معلوم ہوا کہ وارث شاہ کے متعلق بہت سا ذخیرہ آپ کے پاس موجود ہے۔ ہاں مسٹر جوشوا فضل الدین بی۔اے ایڈیٹر "پنجابی دربار" نے جناب چوہدری صاحب سے اس بارے میں ذکر کرنے کا وعدہ کیا، جو کتاب کے پریس میں چلے جانے تک بھی وعدہ ہی رہا۔

۲۔ استاد محترم خان صاحب قاضی فضل حق صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور سے ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ہیر کو میں نے پڑھا ہوا ضرور ہے مگر کسی خاص تنقیدی نظر سے نہیں۔ وارث کے متعلق کسی خاص

تاریخی یا ادبی مواد کے اپنے پاس موجود ہونے کا جناب موصوف نے کوئی ذکر نہ فرمایا۔

۳۔ ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ یونیورسٹی پروفیسر نے وارث کے متعلق جو کچھ اپنی انگریزی "ہسٹری آف پنجابی لٹریچر" میں اور اپنے لیکچرز مندرجہ اورینٹل کالج میگزین لاہور میں لکھا ہے۔ اس کو میں نے بغور پڑھا ہے (گو اس سے میرے مسالہ کتاب میں کوئی ایزادی نہ ہوئی)۔

۴۔ پنجاب پبلک لائبریری اور یونیورسٹی لائبریری سے کوئی خاص مواد یا کتاب نہ دستیاب ہو سکی۔ سر ٹمپل رچرڈ نے اپنی کتاب "لیجنڈر آف دی پنجاب" "(پنجاب کی داستانیں) میں وارث کے متعلق چند مدحیہ فقرات سے زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ پبلک لائبریری کے خطی نسخہ سے کوئی خاص مدد نہ مل سکی۔

۵۔ باوا بدھ سنگھ صاحب انجنیئر آنجہانی کی "ہنس چوگ" میں وارث کی قصہ گوئی کی چند ایک معمولی مثالیں دی گئیں ہیں اور بس۔ اس کتاب نے بھی میری کوئی خاص رہنمائی نہ کی۔

۶۔ ڈاکٹر بنارسی داس نے ہیر مقبل پر ایک انٹروڈکشن لکھی ہے مگر چونکہ مقبل کا صحیح زمانہ ہی نہیں متعین ہو سکتا لہٰذا وہ مقالہ بھی کوئی خاص فائدہ نہ دے سکا۔

۷۔ اسی سلسلہ میں پروفیسر آئی، سی نندا صاحب گورنمنٹ کالج لائل پور اور صوفی محبوب الٰہی صاحب پروفیسر گجرات کالج اور قریشی علی مردان صاحب وکیل شاہ پور سے بھی ملاقاتیں ہوئیں مگر کسی صاحب سے کوئی تحریری مواد نہ مل سکا۔ ہاں وارث کے متعلق عمدہ رائے پیش کر کے ان

حضرات نے مصنف کی ڈھارس ضرور بندھائی۔ پروفیسر شیرانی صاحب کی کتاب، پنجاب میں اردو، کی بھی بہت ورق گردانی کی مگر سوائے وارث شاہ کی ایک غزل کے اور کچھ نہ ملا۔

جب لائبریریوں اور پنجاب کے ادیبوں سے مایوسی ہوئی تو پھر وارث شاہ کے وطن جنڈیالہ شیر خان ضلع شیخوپورہ، اس کی پرانی درسگاہ قصور اور اس کے پیر خانہ پاک پتن میں احباب کو توجہ دلائی۔ مفصل سوالات بھیجے مگر اس طرف سے سوائے سکوت اور خاموشی کے کوئی جواب نہ ملا۔

ان حالات میں وارث شاہ کے سوانح حیات والی فصل کا پیٹ مجبوراً "عام مشہور روایات" ہی سے بھرنا پڑا۔ جس کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ افسوس کہ وارث کے سوانح حیات کے متعلق کوئی قابل وثوق مواد نہ ملا۔ جس سے اس کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، بیعت، عشق و محبت کی داستان، شاعری کی ارتقا تصنیفات وغیرہ پر مزید روشنی پڑسکے۔

ہیر کا بڑے غور و خوض سے مطالعہ کیا۔ مگر چونکہ اس کا متن ہی سرے سے مسخ ہوچکا ہے تو وہ شاعر کے سوانح حیات کے متعلق صحیح حالات یا روایات کیسے بہم پہنچاسکتی ہے۔ تاہم شاعر کی زندگی کے چند ایک پہلوؤں پر ہیر کے متن کی امداد سے بحث کی۔ تنقید یا روائت نے جہاں تک رہنمائی کی۔ اس سے بھی کام لیا مگر افسوس کہ یہ بحث بہت تشنہ رہی۔"

پروفیسر ضیا صاحب نے جس شوق سے وارث شاہ کے حالات و واقعات اور سخوری پر کتاب لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تھا سطور بالا سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کو اپنی سعی لاحاصل پر کس قدر افسوس ہوا ہوگا۔ یہ افسوس ان سطروں ہی پر ختم نہیں ہوجاتا کہ وارث کے سوانح حیات اور پنجابی لٹریچر کی کسمپرسی عرض حال کے

بعد کے باب کا بھی عنوان بنتی ہے اور بایں الفاظ ---

"وارث شاہ کی زندگی کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ یا تو (۱) غیر مصدقہ زبانی روائتوں سے یا (۲) ہیر سے ماخوذ ہے محض زبانی روایات کو معتبر تاریخی واقعات کی سی حیثیت تو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں سے بعض روایات محض خوش اعتقادی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور بعض واقعات سے غلط سلط نتائج نکالنے کا۔ لہٰذا ان کی تصدیق یا تردید کیلئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

باقی رہی ہیر وارث شاہ۔ بد قسمتی سے وہ اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ اس کا اصلی نسخہ اب عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ اس میں الحاقی اشعار کی بڑی تعداد شامل ہو گئی ہے اور اس کی صورت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ اگر مختلف ایڈیٹروں کے موجودہ نسخوں کا باہمی مقابلہ کیا جائے تو یقیناً اس امر میں شبہ پڑ جاتا ہے کہ یہ سارے نسخے ایک شاعر کی تصنیف ہیں یا کئی شاعروں کی۔ مطبع بلالی ساڈھورا ضلع انبالہ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اور میاں پیراں دتہ وغیرہ والی ہیر کے نسخے اس کے شاہد و ناطق ہیں۔

زمانہ - وطن

وارث کی تاریخ پیدائش یا تاریخ وفات معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ۱۱۸۰ھ یا ۱۸۲۰ب میں اس نے ہیر تصنیف کی۔ اس لحاظ سے وہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور سکھوں کی شورشوں کا ہم زمانہ قرار پاتا ہے۔ اس کا وطن جنڈیالہ شیر خاں ہے جو آج کل ضلع شیخوپورہ کا ایک قصبہ ہے اور اس سے آٹھ نو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

وارث نے ہیر میں "وارث شاہ و سنیک جنڈیالڑے دا" کے لفظوں میں اپنے وطن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وارث کا مدفن بھی یہی ہے۔ وارث کا مزار کس

مپرسی کی حالت میں ہے اور لوگوں کی ناقدر شناسی کا ماتم بہ زبان حال کر رہا ہے۔

خاندان

وارث شاہ کے خاندانی حالات بالکل پردۂ اخفا میں ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ قوم کا سید ہے۔ بعض شارحوں نے "پیا مارئیں قطب دیا بیٹیا اوئے" کے حوالہ سے اس کے والد کا نام "سید قطب شاہ" لکھا ہے جس کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے اس شارح کا نتیجہ صحیح ہو۔ اسی طرح اجتہاداً" یا افواہاً" بعض نے وارث کی نرینہ اولاد نہ ہونے کا ذکر کیا ہے اور ایک آدھ لڑکی اس کی اولاد سے تسلیم کی ہے۔"

"یادگار وارث" کے اس طویل اقتباس کا باعث دو باتیں ہیں۔ اولاً" یہ کہ آج سے ۵۷ سال پہلے کی تحقیقی و تاریخی بے بسی میں کوئی قابل مسرت کمی واقع نہیں ہوئی۔ ثانیاً" یہ کہ یہ تصنیف بھی اب نایاب سی ہو گئی ہے اور ان اوراق کے ذریعے میں مصنف موصوف کی کچھ سطروں کو تو دست برد زمانہ سے بچانے کی کوشش کر لوں۔

اس کے بعد یوں تو ۱۹۷۲ء میں پروفیسر سید علی عباس جلالپوری صاحب نے "مقامات وارث" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی لیکن وہ جیسا کہ نام ہی سے واضح ہوجاتا ہے وارث شاہ کے کمالات علم و سخن سے متعلق تھی تا ؔآنکہ ۱۹۸۱ء میں عذرا وقار صاحبہ نے "وارث شاہ عہد اور شاعری" کے عنوان سے اپنے حاصل تحقیق کو کتابی شکل میں ڈھالا اور قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت' اسلام آباد نے اسے اشاعت آشنا کیا۔ اس کتاب میں وارث شاہ کے عہد اور اس کی شاعری سے ہی سروکار رکھا گیا ہے اور وارث شاہ کا ذکر بر سبیل تذکرہ ہی آیا ہے جہاں کہیں بھی آیا ہے۔ عذرا وقار نے تالیف و تصنیف میں خاصی محنت کی تھی۔ کاش

وہ وارث شاہ کے بارے میں بھی کچھ کھوجتیں کچھ لکھتیں کہ وہ ایک بڑے موزوں ادارہ سے وابستہ تھیں اور پنجابی شعر و ادب کا ذوق بھی رکھتی تھیں۔

اردو میں نہ سہی خوشی کی بات یہ ہے کہ پنجابی میں اہل قلم نے اپنے فرض ادا کرنے کی کوشش شروع کردی ہے اور اب کئی قیس اس دشت نوردی میں لگے ہوئے ہیں کہ سوار محمل کا پتہ چلے۔ ان میں سے ہی ایک پروفیسر حمید اللہ ہاشمی ہیں جنہوں نے "سید وارث شاہ" نام کی ایک تحقیقی تصنیف پنجابی زبان میں ۱۹۷۸ء میں پنجاب اور پنجابی شناسوں کے آگے رکھ دی اور اس وقت تک کی تقریباً" ساری تحقیقات کا حاصل اس میں اپنے حاصل مطالعہ کے ساتھ یک جا کردیا بلکہ اس بے چارگی کو بھی جگہ جگہ دہرایا' ضیا صاحب نے جس کی طرف اشارہ کیا تھا۔

یوں اعتراف کرنا ہوتا ہے کہ پنجابی کے اس بڑے مقبول شاعر کے بارے میں کوئی قابل ذکر تحقیقی کام نہیں ہو سکا اور اب وقت بھی اتنا گزر چکا ہے کہ اچانک کہیں سے معجزانہ طور پر کسی راہنما قلمی نسخے کے مل جانے کے بغیر لکھا ہی کیا جاسکتا ہے کہ کسی کے پاس کوئی مصدقہ چیز نہیں جسے لاریبی اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ تفسیریں اور تعبیریں ہیں' جن میں اختلاف کی گنجائش ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

پروفیسر شریف کنجاہی

وارثی عہد اور پنجاب (۱۷۰۷ء سے ۱۸۰۳ء تک)

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ اقتدار کی سد سکندری میں شگاف پڑنے شروع ہوئے تو پڑتے ہی گئے جو یوں تو شاہ جہاں کی وفات کے بعد بھی پڑ گئے تھے لیکن عالمگیری ہاتھوں نے اسے کسی فوری انجام سے دوچار ہونے سے بچالیا تھا جب کہ اس کے اپنے بعد اس کی اولاد میں سے کوئی بھی ایسا جوہر قابل نہ نکلا اور بیٹوں کی جنگ اقتدار کا منفی اثر خود دعویداران تاج و تخت ہی پر پڑا۔ ان میں سے کسی میں بھی وہ دم خم نہ تھا کہ بندہ بیراگی کی دندان شکنی کرسکتا' جس نے بندہ بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا تھا اور نئے سن کا آغاز فتح سرہند سے کیا (۲۴ مئی ۱۷۱۰ء) کہ جب فرخ سیر کے دور (۱۷۱۳ء) میں عبدالصمد خاں کو لاہور کا صوبیدار بنایا اور اس نے بندہ بیراگی کے فتنے کی آگ کو سرد کیا۔ اسی کے ایام اقتدار میں بعض کا کہنا ہے کہ وارث شاہ پیدا ہوا تھا۔ عبدالصمد خاں کا اصل نام عبدالرحیم بتایا جاتا ہے۔ اسی نے قصور کے حسین خاں کی سرکوبی بھی کی تھی (۱۷۲۰ء میں) بلکہ اور سرکشوں کو بھی یا زیر کیا تھا یا ٹھکانے لگایا تھا لیکن جب ۱۷۲۶ء عیسوی میں اس کی جگہ تخت دہلی نے اس کے بیٹے زکریا خاں کو لاہور کی صوبیداری سونپنا مناسب خیال کیا تو سرکشیاں شروع ہوگئیں اگرچہ وہ بے نتیجہ رہیں کیونکہ زکریا خاں نے بھی باپ ہی کی طرح سرکوبیاں کیں۔ جموں کے راجہ دھرپ دیو کو سبق سکھایا جس کی طرف ہیر میں وارث شاہ نے یوں اشارہ کیا ہے۔

"جویں زکریا خاں نے جنگ کیتا لے کے توپ پہاڑ تے کڑکیا ای"

سکھوں کو بھی اس نے پنجاب کے میدانوں سے مار بھگایا بلکہ دور اندیشی

سے کام لیتے ہوئے ان کو جاگیریں دینے اور خطابات عطا کرنے کی راہ اختیار کی تاکہ وہ لوٹ مار کی جگہ سکونتی زندگی کے خوگر ہو جائیں لیکن ان کو یہ چسکا ایسا پڑ چکا تھا کہ وہ اپنے وعدوں پر قائم نہ رہ سکے دونوں کی یہ آنکھ مچولی چل ہی رہی تھی کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے پنجاب پر حملہ کردیا جس سے ایک طرف تخت دہلی کے وقار کو دھچکا لگا تو دوسری طرف صوبوں میں خود عنانی کا رجحان ابھرنے لگا۔ نادر شاہ نے پنجاب سے دہلی کو جاتے ہوئے اور دہلی سے واپس وطن کو جاتے ہوئے راستہ میں پڑنے والی بستیوں کو جس بے دردی سے لوٹا اس کا اندازہ بھی وارث شاہ کے اس مصرع سے ہوجاتا ہے جس میں رانجھا ایک لڑکی کے ذریعے ہیر کی جانب پیغام بھجواتے ہوئے کہتا ہے۔

نادر شاہ توں ہند پنجاب دھڑکے' میرے بھادا تدھ بھچال کیتو

نادر شاہ کی واپسی کو ابھی پانچ سال ہی ہوئے تھے کہ ۱۷۴۵ء عیسوی میں نواب زکریا خاں راہی ملک عدم ہوا اور پنجاب میں پھر فتنوں نے سر اٹھانا شروع کردیا جس کی ابتدا زکریا خاں کے بیٹوں کی باہمی جنگ اقتدار ہی سے ہوئی۔ اس میں شاہنواز خاں کامیاب رہا اور ۱۷ مارچ ۱۷۴۷ء کو لاہور پر اس کا قبضہ ہوگیا لیکن چونکہ دہلی میں اس کے محبوس بھائی یحییٰ خاں کا خسر قمرالدین موجود تھا اس لئے اس قبضے کے حق میں وہاں سے اجازت نامہ ملنے کے بارے میں زیادہ پر امید نہ ہوتے ہوئے اس نے آدینہ بیگ کے مشورہ سے ایک قاصد اور شاہ ابدالی کی طرف بھی بھیج دیا کہ وہ حملہ آور ہو اور اسے لاہور کی صوبیداری پر بحال رکھے۔ یہ درخواست ادھر قبول ہوئی۔ ادھر ایک طرف آدینہ بیگ اور شاہنواز میں ناچاقی پیدا ہوگئی اور ادھر قمرالدین نے (جو شاہنواز کا ماموں بھی تھا) اسے مغلوں کے ساتھ غداری کرنے کا طعنہ دیا جو اپنا کام کرگیا اور ابدالی حملے کے وقت شاہنواز کا رویہ

بالکل بدل گیا۔ چنانچہ جب صابر شاہ شاہنواز خاں کو راہ راست پر لانے کے لئے احمد شاہ کے غیر سرکاری سفیر کی حیثیت سے لاہور آیا تو اس کی بات پر کان دھرنے کی جگہ حکم دیا گیا کہ اس کے حلق میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے جس سے اس کا دم بند ہو گیا۔

اس حرکت نے جلتی پہ تیل کا کام کیا اور احمد شاہ دریا عبور کر کے محمود بوٹی کے قریب خیمہ زن ہو گیا اور جب معرکہ ہوا تو شاہنواز خاں دہلی کی جانب بھاگ گیا۔ وارث شاہ سے منسوب ایک سی حرفی میں اس وقت کی لاہور افواج کے رویئے کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔۔

رناں چنگیریاں اوہناں نالوں جیہڑے شاہ نواز دے سنگ آہا
ہک اکھڑا نس گیا قبضے کئی ہزار اسوار آہا
جاندا ڈٹھا ناہیں کیہڑی طرف گیا جیہڑا لشکراں دا سردار آہا

شاہنواز کے بھاگ جانے کے بعد اکابرین لاہور نے میر مومن خاں، دیوان لکھپت رائے اور دیوان صورت سنگھ (یعنی ایک مسلمان، ایک ہندو اور ایک سنگھ) کو ابدالی کے پاس اطاعت گزاری کی یقین دہانی کے لئے بھیجا، جسے تیس لاکھ روپے بطور تاوان لے کر شرف قبولیت بخشا گیا لیکن ساری یقین دہانی کے باوجود افغان سپاہیوں نے بیرون فصیل محلوں میں لوٹ مار شروع کر ہی دی۔ جس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔۔

طور لاہور دے ویکھ کے جی دور زدیں تے سخت بچھال ہویا
عرش کنب کے کویں ہے تھرہیا کیہا شہر تے قہر کمال ہویا
ندی ویکھ کے تے حالت رون لگی روندی روندی داجیو اچھال ہویا
وارث شاہ جویں جل بابجھ ماہی تویں شہر لاہور دا حال ہویا

احمد شاہ ابدالی اور اس کی افواج نے ایک ماہ سے زیادہ لاہور میں قیام کیا۔ اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور جلے خاں قصوری کو لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ جب کہ وفد میں شامل میر مومن خاں اور لکھپت رائے کو دیوان بنا دیا گیا لیکن اس کی دہلی کی جانب یلغار سود مند نہ رہی بلکہ اسے بعض اس کی شکست ہی گردانتے ہیں۔ چنانچہ وہ ناکام حملہ آور کی طرح لوٹا اور لاہور میں مختصر سے قیام کے بعد جب پشاور کو لوٹ رہا تھا تو چڑھت سنگھ سکر چکیہ نے ایمن آباد کے قریب اس کے لشکر پر حملہ کر دیا بلکہ دریائے اٹک تک اس کا پیچھا کیا۔

مغل یوں تو اپنے اس کارنامے پر خوش تھے اور قمرالدین کی شہادت کا غم بھول گئے تھے (جو اس معرکہ میں کام آیا تھا) کہ اس کے بیٹے معین الملک نے باپ کی کمی پوری کر دی تھی لیکن ۱۷۴۸ء (۱۵ اپریل) کو محمد شاہ چل بسا اور بساط دہلی بساط شطرنج بن گئی اور پنجاب پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی جس سے سکھوں کو سر اٹھانے کا موقع تو ملا لیکن معین الملک کی گورنری نے ان کی دال نہ گلنے دی۔ ادھر ابدالی کے دل میں خلش اسے کہاں چین لینے دیتی تھی۔ چنانچہ وہ دسمبر ۱۷۴۹ء میں پنجاب پر حملہ آور ہوا تو معین الملک میر منو اس سے پنجہ آزما ہونے کے لئے سودھرہ کے قریب دریا کے لاہوری جانب خیمہ زن ہوگیا اور مرکز سے عسکری امداد کی درخواست کی جدھر سے جواب آیا کہ سیالکوٹ، پسرور، گجرات اور اورنگ آباد کے سالانہ مالیے کے عوض صلح کر لی جائے۔ (خیال رہے کہ اورنگ آباد سے مراد موجودہ سرائے عالمگیر ہے جو جہلم کے ادھر والے کنارے واقع ہے) جانبین میں یہ صلح ہوگئی لیکن لاہور سے اس غیر حاضری سے سکھوں نے فائدہ اٹھایا اور گردونواح میں لوٹ مار مچا دی۔ جو عملاً ان کو مہنگی پڑی کہ ہزاروں سکھ جوانا" لقمہ اجل بنے۔

شورشوں اور فتنوں کے ان ایام میں صوبے کی معیشت کا متاثر ہونا قدرتی

امر تھا۔ جس سے مالیے کی ادائیگی بر وقت نہ ہو سکی تو ابدالیوں کے دل میں خدشے جاگنے لگے چنانچہ تیسری بار پھر احمد شاہ پنجاب کی جانب عناں تاب ہوا اور میر معین الملک نے ایمن آباد کے قریب پل شاہ والہ کے قریب مورچے قائم کردیئے تو ابدالی نے راستہ بدل لیا اور نیاز بیگ کے پاس سے دریائے راوی کو پار کرکے شہر کا محاصرہ کرلیا اور چونکہ یہ محاصرہ چار ماہ تک رہا اس لئے اس عرصہ میں قرب و جوار کے لوگوں پر کیا گزری ہوگی اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے اور لاہوری افواج پوری جواں مردی سے لڑنے کے باوجود حالات کا رخ نہ بدل سکیں اور ہتھیار ڈال دینے پڑے اور بہت بڑی رقم بطور تاوان وصول کرنے کے بعد معین الملک ہی کو لاہور کا ناظم رہنے دیا لیکن اب وہ ناظم دہلی کا نہیں افغان حکومت کا نمائندہ تھا۔

ابدالیوں کی جانب سے بے فکر ہو جانے کے بعد میر منو نے سکھوں کی طرف ایک بار پھر توجہ کی اور اعلان کردیا کہ جو شخص کسی سکھ کا سر کاٹ کر لائے گا اسے پانچ روپے انعام دیا جائے گا۔ یہ رقم بعد میں دگنی کردی گئی تھی۔ چنانچہ ایک بار سو سکھ پکڑے اور قتل کیے گئے۔ جس جگہ وہ قتل ہوئے اس کا نام شہید گنج پڑ گیا اور بعد میں سکھوں نے اپنے دور اقتدار میں ان کی یاد میں ایک گوردوارہ تعمیر کیا تھا۔ یہ گوردوارہ چند ماہ پہلے تک لنڈا بازار لاہور میں مسجد شہید گنج کے بالمقابل موجود تھا لیکن اب بابری مسجد کے سانحہ کی آڑ میں بے قابو عوام نے اسے گرادیا ہے) لیکن بقا بقائے خدا است و ملک ملک خدا۔ جلد بعد میں میر منو ایک دن شکار کے ارادے سے نکلا، ایک نو ساختہ قلعہ میں دوپہر کے وقت اترا، کھانا کھایا، قیلولہ کیا سہ پہر کے وقت گھوڑے پر سوار ہوا ہی تھا کہ خواجہ مرزا خاں سکھوں کے کٹے ہوئے سر لے کر آیا۔ موصوف نے سپاہیوں کو انعام دے کر رخصت کیا مگر راستے ہی میں اس کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ خرابی جان لے کر رہی۔ بعض راویوں کا

خیال ہے کہ کھانے میں زہر دیا گیا تھا جو دربار و اقتدار کی زندگی کا ایک معمول تھا۔

میر منو کی موت زہر سے ہوئی ہو یا ویسے پنجاب ضرور ایک بار پھر مسموم ہوگیا اور پھر سے اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہوگئی اور متحارب گروپوں میں ایک طرف میر منو کی بیوی (مغلانی بیگم) تھی اور دوسری جانب اس کا داماد عماد الملک۔ چنانچہ جب آخر الذکر نے اول الذکر کو گرفتار کرکے پنجاب کی حکومت تیس لاکھ روپے کے عوض آدینہ بیگ کو دے دی تو احمد شاہ ابدالی کو چوتھا حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور ۱۴ اکتوبر ۱۷۵۶ء کو لاہور ایک بار پھر ابدالی گھوڑوں کے سموں تلے تھا۔ آدینہ بیگ نے لاکھوں روپے بھی گنوائے اور جان بچانے کی فکر میں دربدری مول لی، جس کی طرف وارث شاہ نے یوں ہیر میں اشارہ کیا ہے۔۔

دینا بیگ دے مگر جیوں پئے غلزی ڈیرا لٹ کے چاکنگال کیتو۔

کیوں کہ وہ جلال آباد، نور محل، نہاڑہ، ہریالہ ہوتا ہوا کانگڑہ کے نواح میں جا روپوش ہوا۔ لاہور سے دہلی اور وہاں چالیس دن قیام کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی واپس لوٹا تو اس نے جاں خاں کو متھرا کے بت خانے برباد کرنے اور وہاں کے ہندوؤں کو لوٹنے کا حکم دیا اور چند دن بعد خود ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس واقعہ کو بھی وارث شاہ نے موضوع شعر بناتے ہوئے کہا ہے۔۔

فوجاں شاہ دیاں وارثا مار متھرا اہن فیر لاہور نوں آئیاں نیں

اس مراجعت کے دوران اس نے امرتسر میں سکھوں کے مشہور مندر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تالاب کو بھی مسمار کردیا تھا اور وارث کے قلم سے یہ واقعہ بھی بچ نہ سکا۔ چنانچہ اس نے کہا ہے۔۔

احمد شاہ وانگوں میرے ویرپے کے پٹ ٹھڈ کے چک دا تال کیتو

اور جب کہ ایک اور جگہ بھی وضاحت کی گئی ہے یہاں چک سے "گورو دا

چک" یعنی امرتسر مراد ہے اور تال سے وہ تالاب مراد ہے جو وہاں تھا اور جس میں نہانا سکھوں کے لئے ثواب کا کام تھا اور آج بھی ہے۔

اس تہس نہس کے بعد احمد شاہ تو حسب عادت واپس چلا گیا لیکن اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور کا حاکم مقرر کر گیا جس کی شادی عالمگیر ثانی کی بیٹی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ تیمور شاہ کا وہ خوف تو نہیں تھا اس لئے سرکش پھر سرکشی پر اتر آئے۔ آدینہ بیگ نے سکھوں کے ساتھ سازباز شروع کردی اور ان کو دوآبہ جالندھر کے حاکم مراد خاں سے لڑوا دیا۔ جس میں سکھوں ہی کا پلہ بھاری رہا۔ ادھر پنجاب افغانوں کی دھونس سے بھی خوش نہیں تھے۔ چنانچہ اب آدینہ بیگ نے مرہٹوں کے ساتھ خط و کتابت شروع کردی اور وہ اشارہ پاتے ہی لاہور پر یلغاری ہوئے۔ تیمور شاہ اور اس کے ساتھی فرار ہو کر کابل چلے گئے اور پنجاب ایک بار پھر قندھاریوں کے ہاتھ سے نکل کر مقامیوں کو مل گیا اور مرہٹوں سے ایک بار پھر پچھتر لاکھ روپے سالانہ کے عوض آدینہ بیگ نے لاہور کا قبضہ لے لیا لیکن جیسے کسی خوف تلے ہو لاہور کی جگہ اس نے بٹالہ میں قیام کو ترجیح دی اور خواجہ مرزا خاں کو لاہور میں اپنا نائب مقرر کیا۔ بٹالہ کے قریب اپنے نام کا ایک قصبہ آدینہ نگر بھی آباد کیا لیکن اس خریداری اور آبادی کو ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ ۱۵ ستمبر ۱۷۵۸ء کو اس کا حکمرانی سے بھی اور آدینہ نگر سے بھی تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔

تیمور شاہ کی پنجاب سے بے دخلی پھر ابدالی حملے کا بہانہ بنی۔ ادھر مرہٹے بھی اب بظاہر کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ پانی پت کے تاریخی میدان نے تیسری بار پھر ایک معرکہ دکھایا۔ یہ اکتوبر ۱۷۶۰ء کی بات ہے۔ جھڑپیں تقریباً اڑھائی ماہ تک چلتی رہیں اور آخر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو اس تاریخی معرکہ میں

اٹھائیس ہزار مرہٹے مارے گئے اور بائیس ہزار گرفتار ہوئے اور مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ ہر چند مرہٹے ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے ختم ہوگئے لیکن ایک اور حریف طاقت یعنی سکھوں کی منزل آسان کرگئے۔ کیونکہ ان کو پتہ تھا کہ ابدالی بابر نہیں ہے کہ یہاں ڈیرے ڈال دے۔ چنانچہ اس بار بھی اس کے چلے جانے کے بعد ایک سکھ جتھے نے رچنا دوآب میں خواجہ مرزا خاں کو شکست دی۔ سکھوں نے سرہند کا محاصرہ کیا اور اس کی مدد کو آنے والے مالیر کوٹلہ کے حاکم کی جاگیر کو تباہ و برباد کیا بلکہ جب نورالدین خاں (ابدالی جرنیل) لاہور کی طرف بھیجا گیا تو چڑھت سنگھ مزاحم ہوا اور اس نے افغانی نمائندے خواجہ عبید خاں (صوبیدار لاہور) کے بھی دانت کھٹے کر دیئے بلکہ بعد میں لاہور پر حملہ کرکے اسے قتل کردیا اور صبا سنگھ نے پنجاب کے حاکم ہونے کا اعلان کردیا۔

یہ اعلان گویا ایک دعوت یلغار تھی اور ایسا ہی ہوا۔ ابدالی افواج چھٹی بار پھر عازم پنجاب ہوئیں اور ان کی آمد آمد کا سن کر سکھ پھر جنگلوں اور پہاڑوں کو چل دیئے لیکن مالیر کوٹلہ کے حاکم کے اطلاع دینے پر کہ سکھ بڑی تعداد میں ایک جگہ موجود ہیں افغانی شہسوار ناگہانی طور پر وہاں پہنچ گئے اور سکھوں کا یوں صفایا کردیا کہ وہ اس واقعہ کو آج بھی بڑا قتل عام گنتے ہیں۔ یہ قتل کاری "کپ" کے مقام پر ہوئی۔ جہاں سے ابدالی افواج برنالہ کو چل پڑیں کہ آلا سنگھ سے بھی نپٹ لیں جس کے خوف نے لاہور اور دہلی کے راستے کو مخدوش بنایا ہوا تھا اور وہ علاقے میں سے گزرنے والوں سے "بتی" وصول کرتا تھا۔ آلا سنگھ نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن آخر گرفتار ہوا اور چار لاکھ روپے تاوان دے کر اس نے جان بخشی کروائی لیکن ابدالی کو معلوم نہیں اس کی کون سی ادا بھائی کہ اس نے اسے خلعت بھی دی

راجہ کا خطاب بھی دیا اور اس علاقے کا حاکم بھی تسلیم کرلیا۔ ادھر لاہور کو لوٹتے ہوئے امرتسر میں سکھوں کے معبد کو بارود لگا کر اڑا دیا اور دسمبر ۱۷۶۲ء میں دیوان کابلی مل کو لاہور کا صوبیدار بنا کر قندھار کو چل دیا اور ایک بار پھر یہ چل دینا سکھوں کے لئے کھل کھیلنے کا اعلان تھا۔ چنانچہ انہوں نے مالیر کوٹلہ کے حاکم سے انتقام لیا بلکہ جان بھی لی۔ سرہند کے والی زین خاں سے تاوان لے کر اس کی جان بخشی کی۔ کابلی مل کو مجبور کیا کہ وہ گائے کے ذبح کرنے پر لاہور میں پابندی لگا دے اور اسے یہ سکھا شاہی حکم ماننا پڑا۔ انہیں ایام میں قصور پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سرہند کو لوٹ کر اسے نذر آتش کیا اور اس فتح کی خوشی میں جسا سنگھ نے شکرانے کے طور پر امرتسر کا وہ مندر دوبارہ تعمیر کروایا جسے احمد شاہ ابدالی نے بارود لگا کر اڑا دیا تھا۔

سکھ سرداروں کی یہ خود سریاں اور من مانیاں ابدالیوں کو کب گوارا ہو سکتی تھیں اور ان پر مقامی عوام بھی کب خوش ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر یعنی ساتویں بار پھر پنجاب پر حملے کے سامان ہونے لگے اور سردار نصیر خاں کی سرکردگی میں بارہ ہزار بلوچ سپاہی بھی ابدالیوں کی امداد کو نکل آئے اور سکھوں کی پناہ گاہوں پر حملے شروع ہو گئے لیکن سکھ پانی پت میں مرہٹوں کا انجام دیکھ چکے تھے اس لئے وہ گوریلا لڑائیاں ہی کرتے رہے اور چھپ چھپ کر ابدالیوں کی واپسی کی گھڑیاں گنتے رہے۔ یہ اطلاع پہنچے پر کہ وطن میں قتال باہمی شروع ہو گیا ہے احمد شاہ کو دو ہفتے کے اندر اندر ہی (مارچ ۱۷۶۴ء میں) واپس جانا پڑا اور یوں یہ حملہ مالی لحاظ سے بھی اور سیاسی لحاظ سے بھی نتیجہ خیز نہ ہوا اور اس نے اس خلش کو مٹانے کے لئے دو سال بعد پھر یلغار کردی کیونکہ اس واپسی سے سکھوں کے حوصلے اور بڑھ گئے تھے اور انہوں نے منصوبہ بنا کر لاہور کی طرف کامیابی سے پیش قدمی کرتے

ہوئے لاہور میں داخل ہو کر لوٹ مار کا بازار گرم کردیا اور پھر معززین شہر کی درخواست پر کہ یہ شہر ان کے چوتھے گورو کا جنم استھان ہے اس لئے گورو کے اس کوٹھے کا احترام کیا جائے دست درازی تو بند کردی لیکن شہر کو اقتدار کے حوالے سے آپس میں بانٹ لیا۔ چنانچہ سوبھا سنگھ کو نیاز بیگ، مزنگ، اچھرہ اور نواں کوٹ والا علاقہ مل گیا۔ کابلی حویلی سے شالامار تک کا علاقہ گوجر سنگھ کو ملا جس کے نام پر آج بھی علاقہ قلعہ گوجر سنگھ سے موسوم ہے۔ شہر کا مرکزی علاقہ کشمیری دروازے، شیرانوالے دروازے اور شاہی مسجد والے علاقے لہنا سنگھ کو ملے۔ ان تین سکھوں کا دور سکھا شاہی کا اپنی ہی مزاج کا دور تھا۔ اسی دور میں باقی ممکنہ لوٹ کے علاوہ مغلیہ دور کی یادگار عمارتوں میں سے قیمتی پتھر نکالے گئے اور انہیں ایام میں لاہور سے دور جاکے دیس میں وارث شاہ ہیر رانجھا کی داستان کے پردے میں دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا اور جب آخری بار ابدالی افواج نے حملہ کیا تو وہ غالباً" اس داستان کو مکمل کرچکا تھا۔ اس حملہ کو سکھوں نے دریائے جہلم کے کنارے ہی روکنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ احمد شاہ سیالکوٹ، جاکے، ڈسکہ اور ایمن آباد کے راستے لاہور کو عناں تاب ہوا تو اس خبر کے سنتے ہی لاہور کے تینوں سکھ اجارہ دار دم دبا کر بھاگ گئے اور لوگوں کی زبان پر یہ شعر عام تھا کہ۔۔

سوبھے دی سوبھا گئی، گجر دا گیا مال

مہنے نوں دینا آیا تنوں ہوئے کنگال

یہ ۲۲ دسمبر ۱۷۶۶ء کی بات ہے جب بمطابق عبرت نامہ جلد اول (ص ۲۴۰) اکابرین شہر کا ایک وفد ابدالی افواج کی شہر میں آمد کے خوف سے لرزاں محمود بوٹی کے قریب خیمہ زن شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ لاہور کا لہنا سنگھ بھنگی کو ہی مقرر کردیا جائے۔ یہ درخواست منظور ہوئی لیکن اسے لہنا سنگھ نے منظور نہ کیا اور

اس کی جگہ دادن خاں کو پنجاب کا صوبیدار اور رحمت خاں روہیلہ کو اس کا نائب مقرر کر کے احمد شاہ نے سرہند کا رخ کیا اور امرتسر میں مزاحم سکھوں کو شکست دے کر سرہند پہنچا، یہاں اس نے امر سنگھ (والی پٹیالہ) کو خلعت، علم اور راجہ راجگان بہادر کا خطاب عطا کیا اور سرہند کی صوبیداری پر مامور کیا اور یوں مشرقی پنجاب میں عملاً" سکھوں کی حکومت کو تسلیم کرلیا اور اس کے بعد بھی ہر چند اس نے ۱۷۶۸ میں اور پھر ۱۷۶۹ء میں فوج کشی کی لیکن ان یلغاروں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا ہاں سکھوں کے لئے راستہ صاف اور آسان ہوگیا اور انہوں نے دادن خاں اور رحمت خاں کا لاہور میں قیام ناممکن بنا دیا۔ اسی ادھیڑبن میں ۱۴ اپریل ۱۷۷۲ء کا وہ دن بھی آگیا جب احمد شاہ ابدالی زمین اور زمین پر کے سارے معاملوں سے ایک طرف ہو کر زیر زمین چلا گیا اور پنجاب سے افغانی اقتدار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا کہ پنجاب کے دو اہم شہر لاہور اور امرتسر ہی نہیں سرہند پر بھی اب سکھوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ دو آبہ رچنا سکرکلیوں کے قبضے میں تھا۔ جھنڈا سنگھ نے دو آبہ سندھ ساگر پر قبضہ کر لیا تھا ملکا سنگھ پنڈی گھیپ، فتح جنگ اور اٹک پر قبضہ کرکے راولپنڈی میں براجمان ہو گیا تھا اور تیمور شاہ افغانستان کے داخلی مسائل میں اس قدر الجھ کر رہ گیا کہ پنجاب سے اس کی دلچسپی کم سے کم تر ہوتی گئی یہاں تک کہ ۱۷۹۳ء میں وہ بھی چل بسا اور راہوار وحشت پر سوار ہونے والے کسی جانشین کو چھوڑے بغیر ادھر سکھوں کو چند سال کے اندر رنجیت سنگھ کے روپ میں ایک قابل دل و دماغ والا شخص مل گیا جس نے عارضی طور پر پنجاب کو بھی پرسکوں بنایا اور سکھی اقتدار کو بھی مستحکم کیا۔

وارث شاہ کے حالات زندگی کے سلسلے میں ہم بھی اپنے دوسرے پیش رووں کی طرح اسی اعتراف عجز کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ

"معلوم شد کہ ہیچ معلوم نیست"۔ اس نامعلومی کا ایک بہت بڑا سبب وہ مخصوص سیاسی اور سماجی حالات تھے جن میں سے پنجاب ان دنوں گزر رہا تھا اور پنجاب میں ہر طرف گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا جارہا تھا۔

یہ ۱۱۸۰ ہجری (۱۷۶۶ء) کی بات ہے جب وارث شاہ اپنی لافانی تصنیف قصہ ہیر رانجھا کو مکمل کرچکا تھا اور احمد شاہ ابدالی نمود فانی کی دھاک بٹھانے کے لئے آگ اور خون کی کئی راسیں پنجاب میں رچا چکا تھا اور اب یہ ڈرامے اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہے تھے کہ ان کے ذریعے مغلیہ حکومت کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ ان حملوں کا آغاز نادر شاہ کے قتل ۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ کے فوراً بعد ہی ہوگیا تھا بلکہ آغاز کی جگہ ان کو تجدید ہی کہنا چاہیے کہ اس کے پیش رو نادر شاہ نے (جس کے ساتھ احمد شاہ خود بھی اس خوان یغما کا ذائقہ چکھ چکا تھا) ۱۷۳۹ء میں ان کے لئے راہ ہموار اور آسان کردی تھی یعنی ہیر کی داستان کے مکمل ہونے سے چالیس سال پہلے یوں وارث نے افراتفری کا وہ سارا دور کافی حد تک خود دیکھا ہوگا یا نادر شاہی چیرہ دستیوں کو نوعمری میں عمر رسیدہ مظلوموں، مجبوروں اور دربدروں سے سنا ہوگا جن کا تھوڑا سا اندازہ آنند رام کی اس تحریر سے ہوسکتا ہے۔ یاد رہے کہ انند رام نواب وزیر قمرالدین کے وابستگان میں سے تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "احوال پنجاب چہ نوشتہ شود کہ برآں دیار و سکنہ آں گلزار چہ قیامت گزشت۔ مثل وزیر آباد و ایمن آباد و گجرات قصبہ جات کہ ہر یکے بنابر کثرت آبادی نیمچہ شہری بودہ است بخاک سیاہ برابر گشت۔" (ترجمہ) پنجاب کی سرگزشت کیا بیان کی جائے کہ اس سرزمین پر کہ اس کے رہنے والوں پر کیسی قیامت گزری۔ یعنی وزیر آباد اور ایمن آباد اور گجرات کے قصبوں پر جن میں سے آبادی کے حوالے سے ہر ایک گویا نصف شہر تھا۔ جل جلا کر اب وہ خاکستر ہوچکے ہیں اور احمد شاہی ستم آرائیاں تو اس کی تملا"

چشم دید ہوں گی جن کا نقشہ محمد بخش آشوب نے زیادہ اشعار میں ایک معاصر ہونے کے حوالے سے کھینچا ہے۔ لاہور کے متعلق وہ یوں گویا ہوتا ہے کہ۔۔

ـ زبیداد افغاں کراں تا کراں۔ ازاں شہر برشد بگردوں فغاں

زتاراج و غارت دراں بوم دہر۔ نماند از کہن خانداں ہا اثر

حذر از چناں دشمنی پرستیز۔ اماں الاماں از چناں رستخیز

(ترجمہ) افغانوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کیے گئے ظلم و ستم کے ہاتھوں۔ اس شہر سے فغانیں اٹھ اٹھ کر آسماں تک جاتی تھیں اور اس ملک کے کسی گوشے میں کوئی قدیم باسی خاندان نظر نہیں آتا تھا۔ خدا ایسے جھگڑے مول لینے والے دشمن سے بچائے اور اس قسم کی مار دھاڑ سے امان دے۔

ایک ہی نہیں تھا۔ لاہور سے بہت دور پسرور کا ایک شاعر دلشاد بھی ان حالات پر اپنا رد عمل یوں ظاہر کرتا ہے (ترجمہ)

قیامت کرد پیہم اشک و افغاں۔ قسون در درانی نہ باشد

آنسوؤں اور نالوں کی لگاتاری قیامت ڈھا رہی ہے۔ کہیں دردرانی (یعنی احمد شاہ) کی فوجیں تو نہیں آگئیں۔

ہندوستان میں کوئی میٹھی نیند سوئے تو کیسے سوئے۔ کہ افغانوں کے آنے سے کانوں میں فغانوں کی آوازیں آرہی ہیں۔

مدت ہوئی ہے کہ کہیں سے آنسوؤں اور افغانوں کی خبریں مل رہی ہیں لگتا ہے کہ شاہ درداراں نے آنا چھوڑ دیا ہے۔

وہ تو یہاں تک کہہ گیا ہے ۔ امن در پنجاب وقت در دراں یا نصیب (در دراں کے دور میں پنجاب کے مقدر میں امن کہاں) جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے ان ہلاکت آفرینیوں نے پنجاب میں مغلوں کی جڑیں کھوکھلی کر کے ایک اور طاقت

یعنی سکھوں کو ابھرنے کا موقع فراہم کردیا۔ "بھوریاں والے راجے کیسے" میں بلھے شاہ کا اشارہ اسی طاقت کی طرف تھا۔ دلشاد پسروری نے ان کو ہی "مودراز" کہا ہے اور یہ حقیقت بھی اسی نے بیان کی کہ۔

بس کہ منع است دریں شہر اذان جمعہ
(اس شہر میں جمعہ کہ اذان بالکل منع ہے)
نکند گوش کسے نالہ بیگاراں را
(اسی طرح بیگار میں لگائے ہوؤں کی فریاد بھی کوئی نہیں سنتا)
موذیاں کردہ ہجوم اے شہ دولا فریاد
(موذی زور پکڑ گئے ہیں، اے شاہ دولا فریاد کو پہنچ
تیغ گجرات سزای مت دل آزاراں دا
(ایسے دل کو آزار دینے والوں کے لئے تیغ گجرات کا بے نیام ہونا ضروری ہے)

دل آزاروں سے یہاں وہی "مودراز" مراد ہیں جن سے متعلق وارث نے کہا ہے۔" سارے دیس تے جٹ سردار آہے گھرو گھری جاں نویں سرکار ہوئی۔

یہاں اس قیامت صغریٰ کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں جو برسوں پنجاب کا مقدر بنی رہی اور جنڈیالہ سمیت کوئی چھوٹا بڑا گاؤں اس کی زد سے بالواسطہ یا بلاواسطہ بچ نہ سکا۔ ہاں یہ اشارہ کرنا نامناسب نہیں کہ تاخت و تاراج کے ایسے ایام میں لوگوں کا بے گھر ہو جانا، کم عمروں کا لاوارث ہو جانا اور ایک گھر کے افراد کا بکھر جانا ایک قدرتی امر ہوتا ہے اور پھر وارث ہی کے الفاظ ہیں "بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے۔" اسی طرح طباعت سے ناآشنا اس دور میں جب کاغذ بھی آج کی طرح سہل یاب نہیں تھا اور لکھنے والوں کی بھی کمی تھی، مخطوطوں کا گراں یاب

کم یاب بلکہ نایاب ہوتے جانا ہی معمول کی صورت تھی۔ چنانچہ ہم تذکروں میں یہ تو پڑھتے ہیں کہ سعد سلمان (لاہوری) کا ایک ہندوی (یعنی پنجابی) میں بھی دیوان تھا لیکن اسے دست برد زمانہ کی نذر ہو تباہی پاتے ہیں۔ ہزاروں اور قلمی نسخوں کی طرح ہیر وارث شاہ بھی اسی انجام کو پہنچی ہوگی اور خو وارث کے مقدر میں جو دربدری آئی اس نے اس کے حالات زندگی کو بھی قعر گمنامی میں ڈبو دیا ہوگا۔

ان سطروں سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وارث شاہ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی نسخہ تیرہویں صدی ہجری میں موجود نہیں تھا۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اشعار کو کیا سمجھا جائے جس میں ہیر ترگڑے واضح طور پر کہا ہے کہ "لکھیا خاص مصنف دا اک نسخہ جنڈیالیوں جا کڈھایا" میری تو اس کے متعلق مودبانہ گزارش یہی ہے کہ انہوں نے نظریہ ضرورت کے مطابق ایسا کیا۔ آخر وہ لوگ مربعوں کے مالک تو نہیں تھے اور اگر ان کو یا ان کے ناشر کو مصنف کا نہیں مصنف کے گاؤں کے کسی بندے کا لکھا ہوا نسخہ مل گیا ہوتا تو کم سے کم اشاعت ترمیمی کے بعد ہی اسے زیادہ داموں فروخت کیا جاسکتا تھا اور انہیں تو پنجاب یونیورسٹی ہی خرید لیتی کہ ان ایام میں قلمی نسخوں کی خریدوفروخت کا کام شروع ہو گیا تھا۔

لیکن ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ وارث شاہ کے اندر شعری میلان کو آغاز ہی سے تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ تو قبول کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے ماحول میں اس حوالے سے ہوتے ہوتے ہی متعارف و معروف ہوا ہوگا اور پھر بھی ایسا نہیں کہ دوسروں کو اس کے آباؤ اجداو کے بارے میں کرید اور سراغ کی ضرورت محسوس ہوتی کیوں کہ شاید ہی کوئی پنجاب کا علاقہ ایسا ہو جس میں موزوں طبع لوگ نہ ہوتے رہے ہوں لیکن شاذ ہی لوگوں نے ان کے بارے میں ضروری جانا ہو کہ ان کے حالات و کوائف کو بھی محفوظ کرلیا جائے کہ لوگوں کو ہمیشہ ان

سے زیادہ ان کے اشعار سے دلچسپی رہی ہے اور پھر وارث شاہ جیسے ''بیخ بریدہ'' یعنی گھر سے بے گھر اور دربدر شخص سے جسے کسی سرکار دربار سے کوئی وابستگی نہ نصیب ہو سکی ہو عوام و خواص کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے ماضی کو پابند قرطاس کرتے اور اگر کسی نے اس دور کے رواج کے مطابق چار سطریں اپنی بیاض میں لکھی بھی ہوں گی تو وہ بیاض بھی حالات کی قبر میں ہمیشہ کے لئے سو گئی ہو گی ورنہ کہیں نہ کہیں سے تو گزشتہ ڈیڑھ دو صدی میں وہ اپنے ہونے کا ثبوت دیتی۔

چنانچہ اب ہمارے پاس وہی اشارے اور حوالے دلیل راہ بننے کے لئے رہ جاتے ہیں جو اس کے کلام میں سے ملتے ہیں۔ انہیں کے بھروسے دو سو سال سے رہ نوردوں کے اندر صحرا نوردی کا شوق بالکل ماند نہیں پڑا۔ اس تھل میں سسی کی طرح نقوش پا کے سہارے چلتے جانا ہی ہر کسی کا مقدر رہا ہے اور رہے گا اور شاید اسی محرومی کے ساتھ۔ یہاں میں نے ''شاید'' لکھ کر مستقبل سے مایوس ہو جانے کی نفی کی ہے کیوں کہ گزشتہ چند سالوں کے اندر بعض نئی راہیں سامنے آئی ہیں اور طالب بخاری صاحب نے وارث کی ایک قلمی سوانح عمری کا بھی پتہ دیا ہے جو اگر درست نکلے تو آج تک کے سارے مفروضے اور انداز غلط ٹھہر کر تحقیق و حقائق کا رخ ہی موڑ دیتے ہیں اور اگر درست نہ ثابت ہو تو اس سے کم سے کم اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ انسان کیا کچھ کر سکتا ہے اور بعض اوقات کسی وقتی سی بے مصرف نمود کی خاطر۔

وارث شاہ کا اتہ پتہ

کلام وارث کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے حالات کی بے رخی اور دھندلاہٹ میں ایک ٹمٹماتا ہوا دیا امید بنتا ہے جو بالواسطہ اور بلاواسطہ ہمارے اس سفر شب کو قدرے آسان کرجاتا ہے۔ یہ وارث کا ایک طرح سے اہم ترین مصرع ہے جس کی روشنی میں ہر کسی نے قدم پیمائی کی ہے۔ کہ۔ "وارث شاہ وسنیک جنڈیالڑے دا تے شاگرد مخدوم قصور دا اے۔" یعنی وارث شاہ جنڈیالے کا رہنے والا ہے اور مخدوم قصور کا شاگرد ہے۔

اس اظہار و اعتراف سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔

ا۔ وارث محض وارث نہیں تھا' وارث شاہ بھی تھا

ب۔ وہ جنڈیالہ کا رہنے والا تھا

ج۔ وہ مخدوم قصور کا شاگرد تھا

اسی ترتیب کو برقرار رکھتے ہوئے ہم پہلے اس کے وارث شاہ ہونے کی طرف آتے ہیں۔ بظاہر اس کی ضرورت نہیں تھی کہ کسی مخالف دلیل یا ثبوت کے موجود نہ ہوتے ہوئے کسی شخص کے اپنے بارے میں کسی بیان یا اعلان کو قبول کرلیاجاتا ہے اور ماضی بعید میں وارث کے وارث شاہ ہونے کے متعلق شک و شبہ کا اظہار نظر سے نہیں گزرا لیکن چند سال پہلے ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں وارث کی سید النسبی کو لاریب ماننے سے انکار کردیا تھا۔ دوسری جانب سید سبط الحسن ضیغم اور تنویر بخاری صاحب بلکہ بعض اور محققوں کا کہنا ہے کہ وہ سید تھے اور انہوں نے موصوف و مرحوم کا شجرہ نسب بھی پیش کردیا ہے جو مختصرا" یوں ہے۔ وارث شاہ کے والد کا نام سید گل شیر شاہ تھا اور وارث خود لاولد تھا۔ دو بھائی قاسم شاہ اور بہادر شاہ تھے۔ وارث شاہ کا سلسلہ یوں سید صدرالدین بھاکری سے جا ملتا ہے اور پھر ان کا دسویں امام علی نقی علیہ السلام ہے۔

لیکن اس شجرہ نسب کو بعض ارباب تحقیق سے ماننے سے انکار کرتے ہیں

اور وارث شاہ کی ولدیت کا مسئلہ وجہ نزاع ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ "بنا عمل دے نہیں نجات تیری، جاسیں ماریا قطب دیا بیٹیا اوئے" میں وارث شاہ نے اپنے والد کا نام لیا ہے اور اس لئے وارث سید گل شیر کا نہیں قطب شاہ کا بیٹا تھا۔ فریق ثانی وارث شاہ کے بھائی قاسم کے بیٹے سید قادر شاہ (مقیم ٹھٹھہ قادر شاہ ضلع شیخوپورہ) کی اولاد کے پاس موجود شجرے کو قطعی شہادت گردانا ہے اور اس پر مصر ہے۔ اس شجرہ کے مطابق وارث شاہ بھاکری سید ٹھہرتے ہیں۔

غرض بعض ارباب تحقیق نے اس شجرہ کو تسلیم نہ کرنے کی راہ اختیار کی ہے اور وہ اسی پر اصرار کرتے ہیں کہ وارث شاہ کے والد کا نام قطب شاہ تھا۔ ویسے ہیر میں ایک جگہ قطب کے بیٹے کہہ کر شاعر نے اپنے آپ کو یوں مخاطب کیا ہے وہ مجازی معنوں میں بھی ہو سکتا ہے کہ تو کسی قطب کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو عمل صالح کے بغیر نجات ممکن نہیں ہوگی۔

جنڈیالے میں وارث کے ابتدائی ایام کیسے گزرے کسی کو کچھ پتہ نہیں اور اگر ہم اس کے والد کا نام گل شیر تسلیم کرتے ہیں تو اس شجرہ کے مطابق اس کے دو اور بھائی ماننے پڑتے ہیں جن میں سے بہادر شاہ غالباً بے اولاد تھا اب یہ معلوم کرنے اور جاننے کی ضرورت پڑتی ہے کہ جن حالات نے وارث کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ وہ کیا تھے؟ یہ اسباب سیاسی افراتفری کے پیدا کیے ہوئے بھی ہو سکتے تھے اور غیر سیاسی یعنی ذاتی بھی۔ سیاسی ہونے کی صورت میں دوسرے بھائیوں کا بھی وہی راہ فرار اختیار کرنا زیادہ قرین قیاس تھا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ تحصیل علم کے لئے چلا گیا ہو اور دوسرے بھائیوں کو اس کا شوق نہ ہو۔ یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ جنڈیالہ ہی کی کسی بھاگ بھری کے لیے شوق فضول و جرات مندانہ باہمی دوری اور ترک وطن کا ایک باعث نہ بن گئے ہوں اور "یاراں اساں نوں آن سوال کیتا" میں اسی بھاگ بھری کی طرف اشارہ ممکن ہے جس کی تائید اس مصرع سے بھی ہوتی ہے کہ۔ "تدوں شوق ہو یا قصہ جوڑنے دا جدوں عشق دی کل

اظہار ہوئی"۔ یہاں قصہ جوڑنے کے شوق میں اسے آغاز کرنے اور پھر پایہ تکمیل تک پہنچانے میں موجود مدارج زمانی کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے۔ بلاشبہ شاعر اس وقت ملے دیس میں تھا جب اس نے قصہ تیار کیا تھا لیکن قصہ جوڑنے کا شوق ممکن ہے اس سے بہت پہلے پیدا ہوا ہو جب ابھی زخم ہرے تھے اور تارو خلش جوان تھی لیکن پھر شاعر کو وہ یک سوئی نصیب نہ ہوئی اور کہیں ٹک کر بیٹھنا میسر نہ ہوا ہو جس سے تکمیل شوق اور تکمیل داستان ایک حقیقت بن سکتی۔ تا آں کہ ملکہ ہانس میں اسے ایک سردار (نواب محمد عظیم) کی قربت حاصل ہوئی اور اس نے اس قصہ کو مکمل کرنا شروع کیا ہو جس میں بالواسطہ سیال دشمن کھرلوں کیلئے سامان مسرت تھا اور شاعر کے لئے کشایش معاش کا بھی۔

لیکن چار ساڑھے چار ہزار مصرعوں کی تخلیق ایک موزوں طبع شاعر کے لئے چند دنوں کا کام نہ سہی پھر بھی عمر بھر کا کام تو نہیں تھا۔ اس لئے اس کے دورانئے کو زیادہ طویل نہیں مانا جاسکتا۔ ادھر ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے ایک سی حرفی (سسی) کی بنیاد پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وارث شاہ احمد شاہ ابدالی کے اس حملہ کے وقت لاہور میں تھا جس میں اس نے مغلوں کے مامور شاہ نواز کو شکست دے کر لاہور سے فرار پر مجبور کردیا تھا یعنی جنوری ۱۷۴۷ء عیسوی میں۔ دوسری جانب سید سبط الحسن ضیغم کا کہنا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے اپنے آٹھویں حملے میں جاکے پر قبضہ کیا تھا۔ یعنی دسمبر ۱۷۶۶ء میں اور یوں وہ سی حرفی جس میں جاکے کا ذکر ہے ممکن ہے قصور میں شروع کی گئی ہو لیکن وہ مکمل پانچ سال بعد ہوئی۔ ضیغم صاحب نے اس سی حرفی کے اس مصرع سے کہ۔ "وارث شاہ علی دے وانگ لڑدا جیہڑا ذات دے وچ ذوالفقار آ!" یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وارث شاہ نے بھی ابدالیوں کے خلاف لڑکر داد شجاعت دی تھی۔

اب اگر ضیغم صاحب کی اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ وارث شاہ نے دسمبر ۱۷۶۶ء میں ابدالیوں کے خلاف تیغ آزمائی کی تھی تو اس سے اس کا یہ کہنا

مشکوک ہو جاتا ہے کہ اس نے ۱۱۸۰ھ (مطابق ۱۸۲۳ب/۶۶-۱۷۶۷ء) میں ہیر کو ملکہ ہانس میں مکمل کیا تھا کیونکہ ابدالیوں کے آٹھویں حملے کی وضاحت کچھ یوں ہے۔ مارچ ۱۷۶۵ء میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب سے وطن کو مراجعت کی تو دس اپریل کو سکھوں نے لاہور پر قبضہ کرلینے کا "گرفتا" پکایا۔ اور (مطابق ۱۱ بھادوں ۱۸۲۲ ب) لاہور پر قبضہ کرلیا۔ اس کی اطلاع پاتے ہی ابدالی نے پھر پنجاب کا رخ کیا۔ دسمبر میں وہ گجرات پہنچا، اور (مذکورہ) جاگمے میں پڑاؤ ڈالا (جو سیالکوٹ کے ضلع میں ہے اور تحصیل ڈسکہ میں) گنڈا سنگھ نے اس کا دوسرا نام جھنگی رکھا ہے۔ یہاں سے وہ ۳۰ دسمبر کو امرتسر جا پہنچا اور دو دن بعد یعنی یکم جنوری ۱۷۶۷ء کو اس نے جنڈیالہ کا رخ کیا تھا (مطابق ۱۸۲۴ ب) اور مارچ میں ستلج پار کرکے عازم وطن ہوگیا۔ یوں اس کا کسی ایسی فوج میں شامل ہونے کا امکان مخدوش ہوجاتا ہے جو ان ایام میں ابدالیوں سے معرکہ آرا رہی کہ وہ تو ملکہ ہانس میں بیٹھا ہوا تیغ قلم سے کھیڑوں کے سرکاٹ چکا تھا اور ممکن ہے وہاں سے اپنے وطن لوٹ آیا ہو اور محمد عظیم (جس کے پاس وہ مقیم تھا) کا نام ابدالیوں کے خلاف کسی محاربہ میں نہیں سنا گیا اور ظاہر ہے کہ سکھوں کی صفوں میں تو وہ جاکر لڑ نہیں سکتا تھا۔

ان بے ربط اور پراگندہ بلکہ پراگندہ کن حوالوں اشاروں کے سہارے یہ امکانی حد تک اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وارث شاہ جنڈیالے سے نکل کر لاہور بھی رہا، قصور میں یقیناً" رہا اور پھر ملکہ ہانس چلا گیا اور اس کا ایک مصرع جس کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی بظاہر واضح انداز میں کہہ رہا ہے کہ ۱۱۸۰ھ میں وہ اس عمر کو پہنچ چکا تھا جب انسان اپنے آپ کو بوڑھا کہنے اور سمجھنے لگتا ہے۔ وہ مصرع یہ ہے۔ "بڈھی عمر آزار اولاد والا جس نوح طوفان اٹھایا ای"۔ اس مصرع میں آزار اولاد والا کی ترکیب ہی سے متقدین میں سے بیشتر نے یہ رائے قائم کرلی تھی کہ وارث شاہ بے اولاد تھا یا نرینہ اولاد سے محروم تھا لیکن اگر اس بول کے آخری حصے کی طرف توجہ دی جائے تو آزار کا باعث کوئی ایسی حرکت بنتی ہے جس کے

نتیجہ میں طوفان نوح کی صورت پیدا ہوگئی تھی اور یہ سب جانتے ہیں کہ وہ طوفان ایک عذاب کی صورت میں اٹھا تھا اور اس بنا پر کہ لوگوں نے حضرت نوح کی نصیحت پر عمل کرنے سے انکار کردیا تھا اور ان انکار کرنے والوں میں خود ان کا بیٹا بھی تھا۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیں تو مصرع کا وہ مفہوم دور از کار اور بے ربط نہیں رہتا جو میں نے لیا ہے کہ وارث کے بیٹے نے بوڑھے باپ کو اپنی پسر نوح والی روش کے ذریعے آزار دیا جس کے نتیجے میں طوفان نوح والی وہ صورت پیدا ہوئی جس نے پسر نوح کی طرح وارث کے بیٹے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوگا اور اگر حضرت نوح ایک پیغمبر ہوتے ہوئے بھی عالم اضطرار میں اسے کشتی میں آبیٹھنے کی آواز دینے پر مجبور ہوگئے تھے تو وارث شاہ جیسا ایک عام آدمی کیوں نہ ظاہرا" اور باطنا" بے چین ہوا ہوگا اور میرے خیال میں ان دنوں اس پر جو کچھ گزری تھی اسے کمال اختصار و اجمال کے ساتھ اس نے اس مصرع کے کوزے میں بند کردیا تھا۔ اپنے اس خیال کو میں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ پنجاب کے پرچے کھوج میں بھی "وارث شاہ بارے ایک گویڑ" کے عنوان سے پیش کیا تھا اور ہیر کے اس اردو ترجمہ کے دیباچہ میں بھی (ص ۱۶) جسے اکادمی ادبیات پاکستان نے گزشتہ سال نومبر ۱۹۹۱ء میں شائع کیا تھا۔

لیکن ایک سوال ضرور اہل تحقیق کے لئے خار راہ بھی بنتا چلا آیا ہے اور سنگ راہ بھی کہ وارث شاہ نے کتنی عمر پائی اور کہاں کہاں کتنا عرصہ رہے۔ طالب بخاری صاحب نے وارث کی ایک سوانح عمری کی بنیاد پر (جس کا پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے) ۱۱۳۰ھ کو سال ولادت مانا ہے اور ۱۲۲۰ھ کو سال وفات۔ ڈاکٹر موہن سنگھ نے تاریخ وفات ۱۷۶۵ء عیسوی (مطابق ۱۸۴۲ب/۱۱۹۹ھ) گردانی ہے اور یہ مان کر کہ "مسی خورد" اسی وارث کی لکھی ہوئی ہے اور اس میں جاملکے کے ذکر سے اندازہ لگایا ہے کہ وارث شاہ کا سال پیدائش ۱۷۲۷ عیسوی (مطابق ۱۷۸۴ب) بنتا ہے۔ پروفیسر حمید اللہ ہاشمی نے اپنی تصنیف سید وارث شاہ میں (ص ۲۵) لکھا ہے کہ

۱۷۰۷ء/۱۸۲۷اب کے بعد وہ اندازہ ہے کہ حیات نہیں تھے چوہدری افضل حق نے معشوقہ پنجاب میں سال وفات ۱۲۲۳ ہجری دیا ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسا معیار نہیں جس سے ان میں سے کسی ایک کے ارشاد کو ترجیح دی جاسکے کہ کسی نے بھی وارث شاہ کی ولادت اور وفات کے بارے میں کوئی سند پیش نہیں کی۔ بجز سید سبط الحسن ضیغم کہ جن کو ایک شعری نکتے کی طرح ایک بات سوجھی کہ اس کو بنیاد بنا کے انہوں نے اپنا خیال پیش کیا کہ وارث شاہ نے ۲۹ جولائی ۱۷۹۲ء عیسوی کو بمطابق ۱۲۰۶ھ وفات پائی۔ یعنی ابدالیوں کے آخری حملے سے بھی چوبیں پچیس برس بعد جب پنجاب کے سلسلے میں سکھوں کے آگے اپنا چراغ نہ جلتا ہوا محسوس کرتے ہوئے اس نے پشاور اور اٹک پار تک کے علاقے پر قناعت کر جانا ہی مناسب جانا اور ماجھا اور وسطی پنجاب کو لاہور سمیت سکھوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا۔اور شاید اسی لئے وارث کا ان ایام میں کہیں کوئی سراغ یا حوالہ نہیں ملتا کہ اس کے مسکن پر سکھ چڑھ آئے تھے اور مان لیا کہ سردار عظیم نے (ملکہ کے والی) نے دوبارہ اس پر قبضہ کرلیا تھا لیکن آن کی آن میں تو یوں نہیں ہوگیا تھا اور عوام کو جن میں سے وارث بھی تھے یہ یقین تو نہیں تھا کہ شکست کل فتح سے بدل جائے گی اس لئے یاتو قصور کی طرح وارث شاہ نے یہاں سے بھی جانا ہی مناسب جانا ہو یا اگر سختی کے ایام اسی نواح میں یا اسی جگہ ہی گزارے ہوں تو بھی ضروری نہیں کہ سردار عظیم کے بعد اس کے بھائی محمد حیات نے بعد میں ان کو اس سلوک اور توجہ کا مستحق جانا ہو جس کے وہ ایام گزشتہ میں عادی ہوچکے تھے اور یوں وہ وہاں سے بھی کسی اور جگہ چلے گئے ہوں اور عین ممکن ہے کہ جنڈیالہ شیر خاں ہی چلے گئے ہوں۔

یہ بات بھی اس سلسلہ میں تحقیق طلب ہے کہ اگر ان کو ملکہ ہانس سے واپس اپنے گاؤں کو لوٹنا تسلیم کرلیں تو اس وقت ان کی مقابلی زندگی کیا تھی۔ مذکورہ بالا شجرے کے مطابق وہ لاولد تھے۔ چوہدری افضل حق ان کو ایک بیٹی کا باپ

بتاتے ہیں اور راقم ایک بیٹے کا باپ ٹھہراتا ہے جو باپ کو چھوڑ گیا اور ممکن ہے ماں نے بھی بیٹے ہی کو خاوند پر ترجیح دی ہو۔ یوں اگر وہ لے دیس سے لوٹے تو تنہا ہی لوٹے ہوں گے کہ جنڈیالہ شیر خاں کے باسیوں میں سے کوئی بھی وارث کے اسلاف میں سے ہونے کا دعویدار نہیں ہے لیکن اس دعویداری کا تعلق جنڈیالہ شیر خاں سے ہے اور اگر اس کا تعلق کسی اور جنڈیالے سے تھا تو ان کے آخری ایام اور گمنامی کے پردے میں چھپ جاتے ہیں۔ قیاس ہے کہ وارث شاہ افراتفری کے ان ایام میں جنڈیالہ شیر خاں ہی کو لوٹ گئے ہوں گے اور خالصہ حکومت یا اقتدار کے خلاف ان کی کی گئی گستاخ گوئی کے باعث انہوں نے اسی طرح خاموشی اور گمنامی میں دن گزارے ہوں گے جس طرح سیاسی مفرور یا شکست خوردہ افراد گزارتے ہیں اور گزارتے آئے ہیں۔

لیکن ضیغم صاحب کی تحقیق بیچ ہی میں رہ گئی۔ جس کی بنیاد یہ ہے کہ پنجاب میں پیروں فقیروں کے عرس عام طور پر ہاڑ (اساڑھ) میں منائے جاتے ہیں۔ جب کہ وارث شاہ کا عرس جنڈیالہ شیر خاں میں ساون کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ اور ۱۷۲۰ء کے بعد ساری اٹھارہویں صدی میں حج کا دن ۱۹ جولائی ۱۷۹۳ (یعنی ۹ ذی الحجہ ۱۲۰۷ھ) اور ۳۰ جولائی ۱۷۹۲ کو ہی بنتا ہے۔ اور ۱۹ جولائی کو ساون کی چوتھی بنتی ہے اور ۲۹ جولائی کو ساون کی چودہ اور وارث شاہ کا عرس چونکہ پندرہ ساون کو منایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تاریخ وفات ۲۹ جولائی ۱۷۹۲ء ہی بنتی ہے۔ (بحوالہ سید وارث شاہ مصنف حمید اللہ ہاشمی ص ۲۵)

ضیغم صاحب کے اندازے سے اختلاف بظاہر ممکن نہیں کہ انہوں نے بات کو منطقی انداز سے چلایا ہے اور وارثان وارث کے پاس موجود ۱۲۲۰ ہجری کی قلمی سوانح عمری کہتی ہے کہ موصوف نے دس محرم ۱۲۲۰ ہجری کو وفات پائی۔ کہ ۱۷۹۵ء یعنی ۱۱۸۰ھ (سال تصنیف ہیر) سے چالیس قمری سال بعد جو بمطابق سن و سال عیسوی ۱۷۹۲ نہیں بنتی کہ چالیس قمری سال چالیس عیسوی سالوں سے دس یوم

سالانہ کے حساب سے چار سو دن یعنی ایک سال ایک ماہ اور چند دن کم بنتے ہیں۔ چنانچہ عبرت نامہ میں رنجیت سنگھ کے قائم مقام پدر ہونے کی تاریخ ۱۲۰۳ ہجری مطابق ۱۷۸۸ء مرقوم ہے اور یوں ۱۷۹۲ء عیسوی ۱۲۰۶ھ کے لگ بھگ بنتی ہے۔ یا پھر اسے کتابت و طباعت کی یا تخمینے کی غلطی قرار دینا پڑے گا۔

قلمی سوانح عمری کا بھی ۱۲۲۰ ہجری میں لکھا ہونا اسے مشکوک بنا جاتا ہے کہ اگر اس سوانح عمری کے مطابق وارث شاہ کی وفات نوے سال کی عمر میں ۱۲۲۰ء ہجری میں مان لی جائے تو اسی سال میں منظوم سوانح عمری کا ہی لکھا جانا ناممکن نہ سہی محال ضرور ہے اور اسی صورت حال نے ڈاکٹر باقر صاحب اور بعض اور محققوں کے اندر جائے ولادت اور جائے وفات کے متعلق ان شکوک کو جنم دے دیا جن کا اظہار انہوں نے اپنی بعض تحریروں میں کیا ہے۔ مذکورہ بالا سوانح عمری میں سے دو اقتباسات یہاں درج کیے جارہے ہیں اور اس توضیحی اضافے کے ساتھ طالب بخاری صاحب نے جسے ضروری خیال کیا۔ بخاری صاحب یوں رقم طراز ہیں۔

عبداللہ شاہ تے وارث شاہ لاولد مرے۔ وارث شاہ نے تے ویاہ ای نہ کیتا تے عبداللہ شاہ دی شادی ہوئی پر بے اولاد مویا۔ سید غلام حسین سکنہ ٹھٹھہ قادر شاہ دی روایت مطابق سید قاسم شاہ دی اولاد وچوں سید قادر شاہ نوں رنجیت سنگھ نے ساڑھے تین ہزار ایکڑ زمین دتی جتھے اہدے بزرگ قادر شاہ نے اپنے نام تے ایک موضع بنایا جیہدا نام ٹھٹھہ قادر شاہ رکھیا۔ سید غلام حسین، سید قاسم شاہ دی نسل وچوں نیں۔ ایہہ اپنی برادری سمیت ایسے موضع وچ ای رہ رہے نیں۔ ایس ضمن وچ قاسم شاہ لکھدے نیں۔

آخر ویلے وارث میںنوں کیتی ایہہ ہدایت
حال حوالہ میرا لکھیں کریں نہ کوئی رعایت
شاعراں وانگوں ہرگز ہرگز کریں نہ گھاٹا وادھا

تیری میری ایویں گزری جوں کشن تے رادھا
حکم اوہدا سر اکھیں من کے لکھاں کل حقیقت
جویں چلیندی آئی پچھے سجناں دی طریقت
بسم اللہ تبسم اللہ پڑھ کے ہتھ قلم نوں لاواں
وارث دی سوانح عمری ہنجواں نال سناواں
تاج محمود ساڈا اک وڈکا آیا چل قندھاروں
شیر خان سنگ ہجرت کیتی مغلاں دی یلغاروں
گل شیر شاہ ہا باپ اساڈا اسیں آہے تن بھائی
عبداللہ شاہ تے وارث شاہ لکھیں وڈے ہائی
دونویں گئے لاولد جہانوں مینوں رب وسایا
بخشی رب ------ اولاد تے نالے علموں شجرہ پایا

اسی طرح وارث شاہ صاحب کی ولادت سے متلعق اسی سوانح عمری میں سے چند اشعار منقول ہیں۔

باراں سے تیہہ ہجری آیا پنج ربیع الثانی   دن جمعے دا وقت تہجد جمیا وارث جانی
صورت شکلوں رج کے سوہنا چندا وی شرمائے   چمکے لاٹ متھے تے نوری ویکھے جو سلاہے
عالم فاضل کٹھے ہوکے رکھن نام پیارا   وارث شاہ چا نام دھرایو خوش ہویا جگ سارا
اولیا اللہ پیدائشی ویکھی جویں کرامت   وارث ساجھی انھے جمیا اللہ کیتی رحمت
اکھیں اوہدیاں روشن ہوئیاں دنیا واہوا کر دی   عمراں بدی چکی اوہنے خدمت اوہدے در دی
ماں اوہدی بھاگ بھری ہا باندی ماڈی جدی   پھلی نہ سماوے ویہڑے پھر دی تھیں بدی
وچ جنڈیالے پیدا ہویا گھر گھر ہوئی چراغاں   ڈالی ڈالی پنچھی گاون چہل پہل وچ باغاں

وارث شاہ وسنیک جنڈیالڑے دا

گزشتہ اوراق کا ماحصل ہمارے خیال میں یہ ہے کہ جب وارث شاہ وارث شاہ تھا اس کے والد کے قطب شاہ ہونے کی جگہ اگر سید گل شیر کو تسلیم کرلیں تو بھی اس کی سید نسبتی متاثر نہیں ہوتی اور اسے سید تسلیم کرتے ہوئے اب ہم جنڈیالہ کی طرف آتے ہیں جسے شاید اس حوالے سے جنڈیالہ شیر خاں کہتے ہیں کہ قصیدہ بردہ کے پنجابی ترجمہ کے آخر میں یوں تحریر ہے۔

ناؤں مصنف سید وارث وچ جنڈیالے وسے
جیہڑا شیر خاں غازی بدھا سب کوئی اوتھے دسے
رہا روز قیامت تیک وسائیں شہر جنڈیالہ
کائی آفت پوے نہ اس تے وسے نت سکھالہ

اتفاق سے اسی جنڈیالہ کے قریب کڑیال کلاں میں پنجابی کے معروف شاعر اور محقق جناب تنویر بخاری رہتے ہیں۔ انہوں نے آج سے برسوں پہلے ماہنامہ "پنجدریا" کے وارث نمبر میں وارث شاہ والے جنڈیالے کے متعلق اپنی کھوج کے مطابق جو لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ "جہاں آج کل جنڈیالہ ہے یہ جگہ بہت ویران اور غیر آباد سی تھی اور چاروں طرف جنڈ ہی جنڈ اگے ہوئے تھے۔ اس لئے اس جگہ بسنے والے گاؤں کو جنڈاں والا کہا جانے لگا۔ جو جنڈاں والا سے جنڈیالہ بن گیا۔ پھر شیر خاں کے نام پر جس نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ جنڈیالہ شیر خاں ہو گیا۔ یہ شیر خاں غزنی پٹھان اور اللہ لوک بندہ تھا۔ اپنے مرشد سخی احمد درویش کے کہنے پر اور اپنے بھائی فتح خاں کو ساتھ لے کر وہ تبلیغ اسلام کے لئے دوآبہ رچنا میں آیا۔ شیر خاں نے یہ گاؤں ۱۵۵۶ء میں آباد کیا تھا جب اکبر بادشاہ کا عہد حکومت تھا۔ ان دنوں سکندر غوری نے پنجاب میں بغاوت کا سر اٹھایا تھا اور ہمایوں نے اکبر اور بیرم خاں کو بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ کیا تھا کہ یہ پیغام پہنچ گیا

کہ ہمایوں اللہ کو پیارا ہوگیا ہے۔ شیر خاں نے اپنے مرشد کے حکم سے یہاں ایک باؤلی بھی بنائی جس پر یہ قطعہ تاریخ لکھا ہوا آج بھی موجود ہے۔

بعہد شہنشاہ اکبر لقب ہمایوں نسب خسروے کامیاب
بفرمودہ سید غزنوی رفیع المکاں خان عالی جناب
محیط سخا و کرم "شیر خاں" ز ابر کرم ہمش برد آب
بنا کرد وائے ز یمن کرم کہ شد رشک سرچشمہ آفتاب
مہ نخشب از شرم ناید بروں اگر یک شب ایں وائے بیند بخواب
ز تاریخ ار گفت ہاتف بمن کہ از چاہ نخشب بگو در جواب

۹۷۶ھ مطابق ۱۵۶۸ء

منشی گوپال داس اسسٹنٹ کمشنر اپنی کتاب تاریخ گوجرانوالہ میں ص ۳۷ پر کیفیت آبادی جنڈیالہ شیر خاں کے عنوان سے یوں رقم طراز ہیں کہ "مشہور ہے کہ بعہد اکبر بادشاہ کے شیر خاں پٹھان نے جو ملازمان بادشاہی سے ایک معزز شخص تھا یہ قصبہ آباد کیا اور متصل اس کے اور بستی آباد کرکے اس کا نام شیر کوٹ رکھا تھا۔" تو یہ قصبہ گویا اسی کے (ساتھ) شامل ہو کر محتاج نام علیحدہ کا نہیں ہوا مگر یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے اس جگہ بقیہ پرانا موسوم بہ جنڈیالہ (جس کو زمینداران ورک ایک دیہہ ویرانہ آباد کیے ہوئے جنڈیالہ بزرگ اپنے کے جانتے ہیں) موجود تھا۔ عمارات شیر خاں سے ایک باؤلی جس کو واں کہتے ہیں اور ایک تالاب پختہ موجود ہے۔ اس باؤلی کی تاریخ کسی استاد نے منظوم کرکے اس پر لکھ رکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارت شیر خاں نے بعہد اکبر بادشاہ ۹۷۶ھ میں بنوائی"۔ مزید لکھا کہ آبادی اس کی چھ بستی پر منقسم ہے۔ زمانہ شورش سکھاں میں جی سنگھ معروف "بڈھا ڈل بجنگ اس پر متصرف ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سمت ۱۸۲۱ بکری میں مہاں سنگھ نے فتح یاب ہو کر اس قصبہ کو اروڑ سنگھ کریالیہ کو بقیہ

جاگیر دے دیا۔ اس وقت چھ بستیوں کی ایک بستی بن کر باسم جنڈیالہ مشہور ہوئے۔ ملکیت اس کی .بقیفہ قوم افغان وغیرہ اقوام متفرق ہے۔ آگے چل کر مزید اشارہ کیا ہے کہ یہاں سات سو گھر اور ۳۵ دکانیں ہیں اور آبادی ۲۵۹۳ ہے۔

بدقسمتی سے ان روایات کے علاوہ کوئی روایت اس گاؤں کے بارے میں نہیں ملی۔ باؤلی میں لکھے ہوئے اشعار سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ باؤلی ۹۷۶ھ میں کھودی اور بنائی گی تھی اور اس کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے کہ آخری شعر میں اصولا" اور رواجا" "من" کی جگہ شاعر کا نام آنا چاہیے تھا یا من' کی وضاحت ہونی چاہیے تھی کہ اس سے کون شخص مراد ہے ہمیں ملازمان شاہی میں سے کوئی قابل ذکر شخص اس نام کا نہیں ملتا جس نے جنڈیالہ یا اس نواح سے کسی تعلق خاطر کی بنا پر اسے بنوایا ہو۔ جنڈیالہ اس شاہراہ پر واقع ہے جو شیخوپورہ کو حافظ آباد سے ملاتی ہے۔ اس شاہراہ سے جاملتی ہے جو خانقاہ ڈوگراں کے پاس سے گزرتی ہوئی آتی ہے اور لاہور کو چلی جاتی ہے کہ اس صورت میں اسے ہم شیر شاہ سوری کے کارناموں میں سے ایک سمجھ سکتے تھے اور شعری مبالغہ آرائی کی ساری گنجائش کے باوجود جس شیر خاں کی ہمت ابر کرم سے بڑھ گی تھی اس کا کوئی گمنام سی شخصیت ہونا قرین قیاس نہیں اور راقم الحروف کو عہد اکبری کے کسی تاریخی حوالے سے اس نام کی کسی شخصیت کا جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے سراغ نہیں ملا۔ اس نادریافتی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ گزشتہ ایام میں لوگوں کو کسی ایک بات یا واقعہ پر خوش ہو کر ملازمان شاہی کو اس قسم کے خطاب دے دینے کا عام رواج تھا۔ مجھے زابر کرم ہمش برد آب" میں آب بردن پر بھی اعتراض ہے کہ یہ محاورہ میں نے کہیں مستعمل نہیں دیکھا۔

دوسری طرف شیر خاں کے غزنی پٹھان ہونے کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا اپنے بھائی فتح خاں کو ساتھ لے کر اپنے مرشد سخی احمد درویش کے کہنے پر تبلیغ اسلام کی خاطر دوآبہ رچنا میں آنا اس کے ملازمان شاہی میں ہونے کی نفی کرتا ہے

اور ایک اور سوال پیدا کر دیتا ہے کہ وہ سخی احمد درویش (جن کی تعمیر جنڈیالہ میں موجود ہے) کون بزرگ تھے کہ غزنی کے تبلیغ دوست لوگوں میں راقم کو ان کا نام نہیں ملا اور پھر یہ تو زیادہ قرین قیاس تھا کہ ان بزرگوں نے ان دونوں بھائیوں کو تبلیغ کی خاطر درہ خیبر پار کرنے کی ہدایت کی ہو اور وہ اس کار خیر کو مرشد کے ساتھ کیے گئے قول کو نباہتے ہوئے جنڈیالے بھی آن پہنچے ہوں اور یہاں ہی کسی وجہ سے ڈیرہ ڈال دیا ہو لیکن یہ بات کہ وہ مرشد کا فرمان مانتے ہوئے دوآبہ رچنا میں آئے تھے مزید تحقیق اور ثبوت کا محتاج ہے۔

یوں کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملنے تک تاریخ گوجرانوالہ کے مصنف کی یہ بات زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے کہ جنڈیالہ نام کا کوئی گاؤں کبھی یہاں موجود تھا کیونکہ اس نام کا یہی ایک گاؤں تو نہیں تھا۔ وزیر آباد کے قریب جنڈیالہ قصاب والا لاہور جانے والی شاہراہ پر موجود ہے۔ ایسے ہر گاؤں کو جو کسی ایسی جگہ بسایا گیا ہو جہاں جنڈ کے درخت تھے یہی نام دیا گیا اور جنڈ پنجاب کے کم بارشوں والے علاقوں میں جن کو باریں کہا جاتا تھا خودرو درخت تھا اور مرزا صاحباں کے قصے میں اسی کی شاخ پر صاحباں نے مرزے کا ترکش لٹکا کر داستان کو المناک رخ دے دیا تھا۔ شاید اس کی زود بائی اور گرمی سردی کو برداشت کر جانے کی خاصیت ہی کی بنا پر کبھی گھروں میں یہ رواج تھا کہ جس کے ہاں نرینہ اولاد ہوتی تھی وہ باہر کے دروازے پر اسکی کونپلیں باندھ دیتا تھا تاکہ ہر کوئی جان جائے اور مبارک دینے کے موڈ میں ہو تو آن کر مبارک بھی دے دے اور منہ بھی میٹھا کر لے۔ بعد میں جنڈ کی جگہ سرس کے پتوں کا مسلمانوں میں رواج ہو گیا تھا۔

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ اس درخت کو سکھوں کے ذریعے تقدس ملا تھا اور جس جنڈ کے نیچے ان کے گوروؤں میں سے کسی نے کبھی آرام کیا تھا اسے جنڈ صاحب کہا جانے لگا اور ایسے ہی کتنے جنڈ تھے جن کی تفصیل شاید بے محل ہے اگرچہ یہ بتلانا ایسا بے محل نہیں کہ تلونڈی صابو کی سے کچھ فاصلے پر شمال کی جانب

ایک جنڈ کے درخت کے نیچے گوروگوبند سنگھ نے بیٹھک کی تھی اور نوکروں کو تنخواہ دی تھی۔ یہ درخت لب آب ہونے کے باعث جنڈ سر کہلایا۔ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جنڈیالہ اصل میں غیر مسلم ورکوں نے آباد کیا ہو اور بعد میں جس طرح اکال گڑھ اور رسول نگر ایک ہی جگہ کے دو نام ہیں اور لارنس گارڈن اور باغ جناح ایک ہی باغ کے۔ اسی طرح جنڈیالہ بھی تبدیل مذہب کرتا رہا ہو اور اگر مہان سنگھ نے فتح یاب ہو کر یہ قصبہ اروڑ سنگھ کریالیہ بصیغہ جاگیر ۱۸۲۱ بکرمی (۱۷۶۴ء) میں دیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وارث شاہ لے دیس میں اس وقت اپنی تصنیف مکمل کرنے کے قریب تھا اور اپنے ہی قول کے مطابق ۱۱۸۰ھ میں۔ یہاں تمام طبع کرنے والوں نے بکرمی سمت ۱۸۲۳ لکھا ہے۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے جس کے متعلق لکھا ہے کہ ۱۸۲۵ بکرمی ہونا چاہیے۔ بہر صورت اس سے ایک وضاحت ضرور ہو جاتی ہے کہ جب وارث قصے کی تخلیق و تکمیل میں مصروف تھا جنڈیالہ شیر خاں سکھوں کے تسلط میں تھا۔ ۱۸۲۳ بکرمی کے حوالے سے ۱۷۶۶ عیسوی میں۔ یوں ہمارے خیال میں ان کا یہ مصرع کہ۔ "احمد شاہ از غیب تھیں آن پوسی رب رکھ جنڈیالے نوں پسپائی" ایک لحاظ سے دعائیہ یا تمنائیہ بنتا ہے کہ خدا کرے یوں ہو جائے اور گاؤں سکھوں کے چنگل سے آزاد ہو جائے اور اسے ۱۷۶۲ سے قدرے پہلے کا سمجھنا چاہیے جب سکھوں کی بعض مثلیں ابھی نئی نئی تشکیل پذیر ہوئی تھیں اور بعض تشکیل پذیر ہونے کے انداز اختیار کر رہی تھیں۔

جنڈیالہ (شیر خاں) کے سلسلے میں گوپال داس کی تحریر کی تفصیل (بحوالہ عبرت نامہ) کچھ یوں بنتی ہے کہ مہان سنگھ اور جی سنگھ کہنیا کے دل ایک دوسرے سے صاف نہیں تھے۔ چنانچہ جب اول الذکر صبا سنگھ کی تعزیت کرکے واپس آرہا تھا تو موخرالذکر نے اس پر حملہ کردیا' جس میں حملہ آوروں کو منہ کی کھانی پڑی اور مہان سنگھ کامران ہوا۔ اس نے جی سنگھ کی حویلی کو توپ زد کرکے منہدم کردیا اور خود مجیٹھ سے ہوتا ہوا گوجرانوالہ آگیا۔ انہیں ایام میں (اور غالباً" اسی ضمن میں)

مذکور ہے کہ سردار مہاں سنگھ نے جنڈانوالہ کو سردار گلاب سنگھ بھنگی سے واپس لے کر اپنے قبضہ میں لے لیا' جسے پہلے اس نے اصلاح احوال کے طور پر اسے دے دیا تھا۔ عبرت نامہ میں وضاحت نہیں کی لیکن قرائن کہتے ہیں کہ جنڈیالہ کو گلاب سنگھ بھنگی سے لے کر ہی اروڑ سنگھ کریالیہ کو دے دیا ہوگا اور ہرچند اروڑ سنگھ کا اتہ پتہ نہیں چلتا جسے بروایت گوپال داس مہاں سنگھ نے جنڈیالہ دیا تھا اور نہ تاریخ پنجاب (کنہیا لال) سے اس کا سراغ ملتا ہے حالانکہ رنجیت سنگھ کا باپ ہونے کے حوالے سے مہاں سنگھ کا ذکر کافی تفصیل سے کیا گیا ہے لیکن اس فقدان سراغ سے گوپال داس کی تحریر کو غلط نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ ممکن ہے موصوف نے جب گوجرانوالہ کی تاریخ رقم کرنی شروع کی ہو اس کو مذکورہ کریالیے کے خلاف کوئی ایسا ثبوت مہیا ہوا ہو جس کو بنیاد بنا کر اس نے اروڑ سنگھ کا جنڈیالہ کے سلسلے میں ذکر کیا ہو کہ سکھی دور اس قدر افراتفری کا اور رنجیت سنگھ سے پہلے اس قدر غیر عملی تھا کہ اس دور کی سوانحی اور تاریخی جزیات سے اسے کورا ہی گننا چاہیے اور بعد میں جب ادھر توجہ ہوئی تو ضروری نہیں تھا کہ اروڑ سنگھ کی سطح کے لوگ بھی زینت قرطاس بنتے۔ ان لوگوں کے نزدیک اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوگی کہ جنڈیالہ کو ضرور شیر خاں سے منسوب کیا جائے۔۔

یہی نہیں۔ سکھوں سے پہلے کے کسی سوانح نگار یا وقائع نگار نے بھی اس نسبت کو اتنا اہم یا ضروری نہ جانا جتنا آج ہم سمجھ رہے ہیں۔ چنانچہ تزک جہانگیری میں بھی اسے محض جنڈیالہ ہی لکھا گیا ہے اگرچہ ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ تزک میں مرقوم ہے۔

باغ دل آمیز (لاہور) سے (بادشاہ کی) پیر کو روانگی ہوئی۔ شہر سے چند کوس کے فاصلہ پر ایک جگہ (ہر ہر) میں قیام کیا گیا اور منگل کو جہانگیر پورہ میں (جسے مترجم نے موجودہ شیخوپورہ قرار دیا ہے)۔ یہاں سے جہانگیر نے جمعرات کو پرگنہ جنڈالہ میں منزل کی۔ ہفتہ کو وہ حافظ آباد کو روانہ ہوا اور ایک منزل کے فاصلہ پر

قیام کیا۔ جمعرات کو ایک بنوائے گئے پل کے ذریعے دریائے چناب کو پار کر کے حوالی پر گنہ گجرات میں منزل کی۔ ایک اور جگہ پھر مذکور ہے کہ (۱۶ شوال ۱۰۱۵ھ) جنڈالہ گاؤں کے قریب جہاں ایک منارہ بنوایا گیا تھا ہے ایک کالے ہرن کے پیٹ پر ایک گولی ماری۔ زخمی ہوتے ہوئے ہرن نے ایسی آواز نکالی کہ ایسی آواز مستی کے علاوہ ہرن کسی وقت نہیں نکالتے۔ جہانگیر پورہ بالفاظ جہانگیر "میری مقررہ شکارگاہ ہے۔ اس کے حوالی میں منسراج نامی ہرن کی قبر پر میرے حکم سے ایک مینار تعمیر کیا گیا۔ اس ہرن کی ندرت کی بنا پر میں نے حکم دیا کہ کوئی شخص اس جنگل کے ہرن کا شکار نہ کرے۔

میں نے سکندر معین سے جو اس پرگنہ کا جاگیردار ہے یہ کہا کہ جہانگیر پورہ میں ایک مضبوط قلعہ بنوایا جائے۔

یہاں سے چل کر میں نے پرگنہ جنڈالہ میں منزل کی (جمعرات ۱۴ ذی الحجہ)۔ پھر وہاں سے ۱۶ کو حافظ آباد سے ایک منزل پہلے اس مکان میں مقام کیا جسے وہاں کے کروڑی میر قوام الدین نے تیار کیا تھا۔ جہاں سے دو مرتبہ کوچ اور قیام کے بعد دریائے چناب کے کنارے پہنچا۔

۱۰۲۹ھ کے تحت مرقوم ہے کہ (کشمیر سے واپسی پر) نکھالہ (کلیالہ) میں شکار کھیلا۔ جہاں سے روانہ ہو کر دس منزل کی مسافت طے کرنے کے بعد جہانگیر آباد میں قیام کیا۔ یہ سرزمین شاہزادگی کے زمانہ میں تعمیر کرائی تھی اور سکندر معین کے جو میرے قریبی قراولوں میں تھا یہ عمارت حوالے کر دی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے بعد اسے پرگنہ قرار دے کر میں نے یہ پرگنہ اس کی جاگیر میں دے دیا تھا اور حکم دیا کہ وہ یہاں ایک دولت خانہ اور تالاب اور ایک منارہ تعمیر کرے۔ اس کی وفات کے بعد سے پرگنہ ارادت خاں کی جاگیر میں دے دیا گیا اور عمارت کی تکمیل اس کے سپرد کی۔ یہ تالاب نہایت وسیع ہے۔ اس کے درمیان ایک دل نشین تعمیر کرائی گئی ہے۔

یہاں یہ تو واضح ہے کہ تزک جہانگیری والا جنڈیالہ وہی ہے جسے اب جنڈیالہ شیر خاں کہتے ہیں۔ تاہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیر خاں ملازمان شاہی میں سے کیسے تھا۔ اس کے لئے اکبر کے ہنگامہ ہائے روز و شب پر نظر ڈالئے۔ آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اس سال اکبر چتوڑ کو سر کرنے گیا ہوا تھا۔ اکتوبر ۱۵۶۷ میں اس نے قلعہ کا محاصرہ کیا اور فروری 1568 میں اسے سر کرلیا۔ ۱۵۶۹ میں رنتھمبور کے راجہ کو مطیع کیا اور ۱۵۷۰ میں جیسلمیر اور بیکانیر کے راجاؤں کو۔ یوں شیر خاں کا کوئی سکہ بند ملازم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں کسی ایک یلغار یا لڑائی میں شامل ہو کر ثواب اور مال اندوزی کرنے والوں میں اسے شمار کیا جاسکتا ہے جو ان ایام میں بکثرت ہوتے تھے لیکن وہ ملازمان شاہی نہیں ہوتے تھے۔

شاگرد مخدوم قصور والے

اب ہم مصرع کی آخری نشان وہی کی طرف آتے ہیں اور جنڈیالہ سے قصور پہنچتے ہیں۔ جنڈیالہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اس شاہراہ سے چند کوس ہٹ کر ہے جو شیخوپورہ میں سے گزرتی ہوئی لاہور کو جاتی ہے اور قصور جانے والوں کو بظاہر لاہور میں سے گزرنا پڑتا تھا اور اسی لیے پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ کے اس قیاس میں کافی جان ہے کہ احمد شاہی حملہ کے وقت یا اس سے پہلے کچھ بعد وارث شاہ لاہور میں تھا کیوں کہ ایک بے سہارا سے آدمی کے لئے جسے اپنے مالی وسائل کے پیش نظر قدم پیمائی کرتے ہوئے ہی کہیں پہنچنا ہوتا تھا قصور بیک جست چلے جانا ممکن نہیں تھا اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جب وہ گھر سے نکلا ہو تو قصور ہی کی نیت سے نکلا ہو۔ بشرطیکہ ہم مفروضہ بھاگ بھری کا بھی جنڈیالہ سے قصور جانا قبول نہ کریں کیوں کہ لاہور کے حوالے سے شیخوپورہ کے پاس سے گزرنے والی سڑک ہر قدم پیما کے لئے ایک کشش رکھتی تھی اور اب کی طرح فاصلوں پر بسنے والوں کے لئے لاہور ان دنوں بھی ساری خرابیوں کے باوجود "روشنیوں کا شہر" تھا۔ اور صدیوں سے یہ کہاوت گجرات کے نواح میں مشہور تھی کہ "جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا"۔ تو جنڈیالہ کے باسی بھی ضرور اس کو دیکھنے کے آرزو مند ہوں گے اور قدرتی بات ہے کہ بلاوجہ گھر سے نکلنے والے کے لئے اس قربت کے باعث وہاں بڑی کشش تھی اور اگر حصول علم ہی کو محرک مان لیا جائے تو بھی اس صدر مقام میں کتنی ہی درسگاہیں تھیں جہاں یہ تقاضے پورے کیے جا سکتے تھے کہ بڑے شہر گئے گزرے دور میں بڑے رہے ہیں اور بے یار و مددگار لوگوں کے لئے کہیں نہ کہیں کوئی پناہ گاہ نکل ہی آتی تھی۔ کتنے ہی روحانی دربار تھے جہاں سے کھانا مفت مل جاتا تھا اور تدریس و تعلیم تو تھی ہی مفت۔

لیکن وارث کا لاہور کو کسی نرمی گرمی کے حوالے سے یاد کرنا اس قیاس کو مضبوط کرتا ہے کہ وہ شہر اس کی منزل نہیں تھا اور اس کے ساتھ اس کا کوئی جذباتی رشتہ استوار نہ ہو سکا جس کے باعث اس کی تباہی اسے بے چین کرتی۔ ورنہ جہاں قصور بہت کم دفعہ تاراج ہوا (اور وارث کے ایام شعور میں تو ایک آدھ بار ہی ایسا ہوا) وہاں لاہور کو مرہٹوں نے لوٹا، سکھوں نے لوٹا، نادر شاہ نے لوٹا، اور احمد شاہ ابدالی نے پے در پے لوٹا لیکن وارث کے لبوں سے ایک بار بھی اف تک نہ نکلی اور لاہور کا ذکر بایں انداز ہی ہیر میں ملتا ہے۔

--- عالم اہل علما ہن چپ سارے جاہل مسلیاں وچ لاہور کیسے (ہیر ۱۱۹)
--- شاہو کار دا مال جیوں وچ کوٹاں دوارے چوکیاں پھرن لاہور وانگوں (ص ۷۰)
--- اڈی بنت دیکھو نال نخریاں دے مال زادیاں وچ لاہور ہونیاں

لیکن ذہن کہتا ہے کہ دھیدو کی طرح وارث اپنی منزل تک جانے کے لئے ہی گھر سے نکلا تھا اور جب ہم مشہور فارسی شاعر عراقی کو ملتان آ جانے، طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج سراج کو منگولی یورش کے ایام میں دروں کو پار کرتے سندھ میں قباچہ کے پاس اور پھر وہاں سے سلاطین دہلی کے دربار سے وابستہ ہو جاتے دیکھتے ہیں تو یہیں وارث شاہ کے مقدروں کا سفر بہت مختصر نظر آتا ہے اور اس کا غیر مبہم الفاظ میں کہنا کہ "سارے ملک خراب پنجاب وچوں مینوں وڈا افسوس قصور دا اے" کسی جذباتی تعلق کی نشاں دہی کرتا ہے، جس طرح اس برصغیر کی تقسیم کے وقت ایک آدھ فلمی کہانیوں اور واہگہ آرپار کے کئی افسانوں اور بعض ناولوں میں دلوں کی کسک ظاہر ہو کر رہی تھی۔

یادگار وارث کے مصنف نے اور دوسرے بہت سے ارباب علم و نقد نے اس افسوس کا پس منظر قصور کے وارث شاہ کی درسگاہ ہونے کو ٹھہرایا ہے جس سے بالکل انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اساتذہ سے بعض شاگردوں کا ایسا تعلق خاطر پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھنے لگتے ہیں

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی مخدوم قصور کی درسگاہ پر ان یورشوں میں واقعی کوئی ایسی افتاد آن پڑی تھی جس پر سارے ملک پنجاب سے بڑھ کر افسوس کرنا ضروری تھا۔ اندازہ لگانے کے لئے یہاں تاریخ اولیائے قصور (مولفہ مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم) میں سے صفحات ۲۰۴ تا ص ۲۰۷ درج کیے جاتے ہیں۔

" قصور بھاری قصبہ اور پرانی بستی اور نامور مکان ہے۔ چونکہ آبادی اس کی منتشر اور منحصر بچند کوٹ ہے۔ اس لئے اہل طبائع نام اس کا قصور جمع قصر بیان کرتے ہیں۔ اور ہنود بیان کرتے ہیں کہ اصلی نام اس کا کشور ہے اور کشور کا اختصار کشوپور ہے علی نحو لاہور اختصار لودپور اور کہتے ہیں کہ کشو اور لود دونوں بیٹے رام چند کے تھے جس زمانہ میں لود نے لودپور المعروف لاہور آباد کیا۔ اسی زمانہ میں کشو نے کشو بعد المعروف کشور کی بنیاد رکھی۔ اگر یہ بات حقیقت میں درست سمجھی جائے۔ تو پھر قصور کہنا قصور ذہن ہے۔ ۱۴۸۲ء[1] میں بابر شاہ نے یہ بستی بہت ویران اور غیر آباد تھی پٹھانوں کو جو کہ ہمرکاب شاہ ممدوح ولایت مغربی سے آئے تھے بطور معافی مرحمت کی۔ انہوں نے بڑے شوق سے اس کی آبادی کو بڑھایا اور مکانات پختہ بنوا کر موضع کو صورت قصبہ بنایا۔ بعد کچھ مدت کے ہر ایک سردار اور رئیس پٹھان نے علیحدہ علیحدہ بستی اپنے نام پر آباد کرائی اور چند پشت تک رونق بڑھتی گئی۔ حتی کہ طول آبادی کا تین میل تک اور عرض دو میل تک پہنچا۔ چنانچہ ہنوز کھنڈریں موجود اور اس دعویٰ پر مبینہ کافی ہیں۔ بعد انتقال جلال الدین اکبر کے پٹھان مضمحل ہوگئے۔ اس لیے رونق اور آرائش نے بھی تنوع پایا۔ عہد شاہ جہان و عالمگیر میں پھر پٹھانوں کی بن آئی اور بستی نے بھی رونق پائی۔ ہر ایک، رئیس نے اپنا آرام گاہ اور محل سرا علیحدہ تیار کرایا۔ اور عمارات دیرینہ اور قصور منہدمہ کی ترمیم اور تعمیر از سر نو عمل میں آئی۔ حتیٰ کہ تادوران خاتمہ ریاست محمد شاہ مرحوم بتدریج چند کوٹ پختہ تیار ہوگئے بدیں تفصیل:

---

[1] یہ تاریخ غلط ہے۔

کوٹ خواجہ حسین مبنیہ سنہ ۱۷۸۲	کوٹ قلعہ پختہ مبنیہ سنہ ۱۸۰۳
کوٹ غلام محی الدین مبنیہ سنہ ۱۸۰۵	کوٹ مراد خان سنہ ۱۸۰۵
کوٹ بدرالدین مبنیہ سنہ ۱۸۰۷	کوٹ رکن الدین سنہ ۱۸۱۲

۱۸۱۷ء میں نواب خواجہ حسین خان رئیس اعلیٰ و جاگیردار قصور کی صوبہ لاہور سے ناموافقت ہوگئی۔ جس کی تادیب کے لئے لاہور سے فوج جرار بھیجی گئی۔ حتیٰ کہ بمقام نہرچو کی لڑائی ہوئی۔ جس میں حسین خاں نے شکست کھائی۔ آخر حسین خاں بے دخل اور اس کی جگہ پر برہان الدین اور جلے خان پٹھان اخوان ہم جد حسین خان معزوز اور مامور ہوئے اور کچھ مدت تک سرداری ان کے خاندان میں رہی۔ بدوران حکومت نواب خان بہادر ناظم پنجاب نیا انتظام عمل میں آیا اور تعلقہ قصور دو حصہ پر منقسم ہوا۔ جس میں سے ایک حصہ پر رحیم داد خان پٹھان اور دوسرا حصہ کمال الدین پٹھان کو مرحمت ہوا۔ تھوڑے دنوں تک تو انہوں نے امن و چین سے حکومت کی بعد اس کے تنزل ریاست اہل اسلام اور تزلزل حکومت لاہور تفرقہ پڑ گیا۔ جب جابجا لوٹ مار شروع ہوگئی۔ تو ان پٹھانوں میں بھی آپس میں اختلاف اور بے اعتدالی وقوع میں آئی۔ جو کوئی غالب اور قوی بازو ہوتا رہا، لوگ اسی کی متابعت اختیار کرتے رہے اور سکھوں نے بھی قصوریوں پر پے درپے کئی حملے کیے۔ کبھی مغلوب ہوتے رہے اور کبھی غالب۔ حتیٰ کہ نوبت سرداری نظام الدین خان پٹھان تک پہنچی۔ یہ شخص بڑا بہادر اور اہل تدبیر تھا اس لیے اس قدر اور تعدی سکھاں میں اس نے قصوریوں کو اپنا ہمراہ اور مددگار اور ملازم یا مصاحب یا شریک ریاست بنا کر اپنی ریاست اور نوابی کو فروغ دیا۔ اس کے عہد میں اور کئی کوٹ اور قصور معمور ہوئے۔ چنانچہ درمیان بستی قصبہ قصور کے کوٹ حلیم خان، کوٹ فتح دین، کوٹ سرائے والا، کوٹ عبدالغنی اور کئی پختہ مکانات تیار ہوئے۔ سکھوں نے بھی اس پر کئی حملے کیے اور اکثر غالب ہوتے رہے مگر ایک

دو بار سرداران بھنگیاں نے اس کو لاچار کیا۔ پہلی جرات اس نے کی کہ سنہ ۱۸۲۰ میں ان کا ڈیرہ راہ گزر لوٹ لیا۔ جس کی پاداش میں سردار جھنڈا سنگھ و گنڈا سنگھ بھنگیاں نے بہ جمعیت کثیر اس پر حملہ کیا۔ اور بہت خوں ریزی ہوئی۔ آخر بھنگی غالب ہو کر قصور پر متصرف ہوئے اور پٹھان اپنے اپنے کوٹوں میں محصور، دو تین روز تک نشانہ بازی ہوتی رہی اور سکھوں نے آبادی ہائے بیرونی کوٹ ہائے محصور میں دست غارت دراز رکھا اور مکانات خوانین گرا دیئے بلکہ بہت آدمیوں کو تلف کیا مگر کسان محصورین کو گرفتار نہ کرسکے۔ کیونکہ لڑائی بندوق بازی کی تھی۔ سوائے اس کے اور کوئی تدبیر یاد نہ تھی اور نہ سامان حرب موجود، ناچار بعد تھوڑے دنوں کے ماحصل کو غنیمت مغتنم سمجھ کر امرت سر کو لوٹ گئے۔ ۱۸۲۷ بکرماجیتی میں پھر بگاڑ ہوا اور تھوڑے دنوں تک لڑائی ہو کر آخر بھنگیوں نے فتح پائی۔ بہت پٹھان ارکان حکومت اور بہت رعیت بے گناہ ماری گئی۔ خصوص قلعہ غلام نبی خان میں نہر خون کی چلی۔ بعد اس کے نظام الدین خان نے لاکھ روپہ دے کر اطاعت محکومی اختیار کی۔ پھر تو چند سال تک امان رہا جب تک رنجیت سنگھ نے لاہور نہ لیا۔ یہ سطریں حسین خاں کے عبدالصمد خاں سے محاربہ و مقاتلہ سے رنجیت سنگھ کے آغاز اقتدار کا محیط ہیں اور اگر داستان ہیر کی تکمیل ۱۸۲۳ بکرمی (مطابق ۱۱۸۰ ہجری) تسلیم کی جائے تو اس قصہ سے چھبیس بکرمی سال بعد تک اور اس کو تسلیم کرلیتے ہوئے کہ وارث شاہ کی وفات ۱۷۹۲ عیسوی میں ہوئی تھی لیکن نہ ان سطروں سے اور نہ کسی اور حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ وارث شاہ کے قصوری مخدوم اور ان کا خاندان یا ان کی درسگاہ پر کوئی غیر معمولی بجلی گری تھی۔ جو غیر معمولی ملال و اندوہ کا باعث بنی ہو۔

اب ہم لفظ مخدوم کی طرف آتے ہیں۔ بظاہر اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جس کی خدمت کی جائے۔ یا وہ کسی حوالے سے اس قابل ہو کہ اس کی خدمت کی جائے۔ چنانچہ مخدوم زادہ استاد کے بیٹے کو بھی کہا جاتا ہے اور مخدوم

عالم علامہ الدین حسن شاہ والی بنگال کے ایک بیٹے کا بھی نام تھا اور ملتان میں لفظ ایک روحانی حوالے والے خاندان کا حصہ بن چکا ہے اور معنوی لحاظ سے سید کے بہت قریب ہے لیکن جس طرح سید نکرہ سے معرفہ بن چکا ہے اسی طرح مخدوم بھی اب مخصوص مفہوم کا حامل ہو چکا ہے۔ چنانچہ سید محمد غوثؒ کو مخدوم ہی کہا جاتا تھا جو پندرھویں صدی عیسوی میں حلب سے ادھر تشریف لائے تھے اور پاک و ہند کے سلسلہ قادریہ کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کے جانشین سید عبدالقادر ثانی کو بھی مخدوم ہی کہا جاتا تھا۔ اسی طرح ان کے صاجزادے سید عبدالرزاق جیلانی بھی اسی احترامی نام سے یاد کیے جاتے تھے اور ان کے بڑے صاجزادے سید حامد جہاں بخش بھی اور یہ نام اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا گیا بلکہ ابھی تک چل رہا ہے اور اسی حوالے سے محمد سجاد حسین قریشی (جو پنجاب کے گورنر بھی رہے) مخدوم کہلواتے تھے لیکن اس طرح کا کوئی حوالہ قصور کے کسی خاندان کا حصہ نہیں بنا۔ اگرچہ دائرہ المعارف مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی میں حضرت غلام مرتضیٰ کے نام تلے لکھا ہے کہ سارے برصغیر سے طلبہ حصول علم کے لئے مخدومان قصور خصوصاً" مخدوم مرتضیٰ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۶۱ ہجری میں پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد آپ سے علمی روابط قائم کیے تھے۔ دائرہ میں بلھے شاہ کے زیر عنوان حضرت غلام محی الدین کے زیر عنوان تحریر ہے کہ "غلام محی الدین قصوری بن شیخ مصطفیٰ بن مخدوم مرتضیٰ۔" یعنی مخدوم ان بزرگوں کا مخدومان ملتان کی طرح خاندانی نام یا لقب نہیں تھا اور ہر پسند ان کو اس احترامی نام سے یاد کرتے ہیں کوئی حرج نہیں ہے لیکن تحقیق کا تقاضا ہے کہ اس سلسلے میں مزید کنج کاوی کی جائے۔
شاید اسی لئے یادگار وارث میں لکھا ہے کہ "وارث شاہ کی تعلیم و تربیت کا حال بھی اس کے باقی سوانح حیات کی طرح صحیح صحیح معلوم نہیں ہے۔ غالباً" اس نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی ہو گی۔ چونکہ بڑا طباع اور ذہین تھا لہٰذا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے قصور گیا۔ جو اس وقت پٹھانوں کی راج دھانی اور اسلامی کلچر

کا مرکز تھا۔ اپنے استاد کو مخدوم قصور کے لقب سے یاد کرتا ہے جس سے وارث کے بعض شارحین نے حافظ غلام مرتضیٰ مراد لی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

لیکن سماعی باتوں کو کبھی کبھی ہم بہت زیادہ اہمیت دے جاتے ہیں۔ چنانچہ ضیا صاحب نے بھی بہت احتیاط برتنے کے باوجود یہ لکھ ہی دیا ہے اور کسی قوی ثبوت کے بغیر کہ قصہ ہیر رانجھا کو ختم کرنے کے بعد وارث شاہ استاد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ "قصہ لکھ کے جا استاد اگے ڈھویا رکھیا نظر منظور دا اے۔" پہلے تو انہوں نے کتاب کو سخت ناپسند کیا مگر جب پڑھوا کر سنا تو بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ "تم نے مونج کی رسی میں لعل پرو دیئے ہیں۔" میاں ضیا صاحب نے جو مصرع نقل کیا ہے وہ بات کو وقیع بنانے کے لئے کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اس کا زیادہ مسلمہ نسخوں میں نہ ہونا اسے الحاقیوں کی صف میں شمار کروا جاتا ہے اور یہی صورت مونج اور لعل والی داستان کی ہے۔ آخر استاد نے پہلے بلاوجہ تو ناپسند نہیں کیا تھا کہ بعد میں اپنی بات کے الٹ کہنا ضروری ہو جاتا۔ اسی قسم کی داستان داستان طرازوں نے غنیمت کنجاہی کے بارے میں بھی کہی ہوئی ہے کہ جب وہ اپنی نیرنگ عشق لے کر اورنگزیب کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ "مضمون زشت است ولے ز آب زر نوشت است"۔ حالانکہ اسے اورنگ زیب سے ملاقات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا تھا اور پھر بعض نے ایک کا نام لیا ہے بعض دوسرے کا۔ مولا بخش کشتہ نے پنجابی شاعراں دا تذکرہ ص ۱۱۶ میں لکھا ہے کہ وہ قصور میں مولوی غلام محی الدین سے درس لیتے رہے جو جامع مسجد کوٹ شہر قصور میں درس دیتے تھے یا مولوی غلام مرتضیٰ سے پڑھتے رہے۔ یعنی حتمی طور پر کشتہ صاحب کے مطابق کسی ایک کو بھی وارث شاہ کا استاد اور مخدوم نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن چونکہ ڈاکٹر احمد حسین قلعہ دار غلام الدین کو علمائے عہد عالمگیری میں شمار کیا ہے اس لئے وہ وارث شاہ کے مخدوم نہیں بنتے۔

وارث شاہ کے اپنے آپ کو مخدوم قصور کا شاگرد کہنے والا مصرع ڈاکٹر محمد

باقر صاحب نے ہوپ ایڈیشن میں نہ ہونے کی بنیاد پر مشکوک قرار دیا ہے اور مخدوم وارث ہونے کے بارے میں بھی تمام متفق نہیں کہ غلام محی الدین صاحب کو تسلیم کیا جائے یا غلام مرتضیٰ صاحب کو لیکن اس میں مذکور کتابوں کے ناموں سے اکثر سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہے کہ وارث شاہ نے عربی فارسی کی وہ تمام کتابیں خود بھی پڑھیں تھیں بلکہ دستار فضیلت بھی حاصل کی تھی۔ چنانچہ سید علی عباس جلالپوری "مقالات وارث" میں لکھتے ہیں کہ وارث شاہ جامع کمالات تھے اور ہیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ و سیر پر کامل عبور تھا اور وہ تصوف و عرفان کے اسرار و رموز پر گہری نظر رکھتے تھے۔ طب، علم نجوم اور موسیقی سے بہرہ ور تھے" (ص ۹۰) اور یہ تحصیل و اکتساب بھی کسی جگہ اور کسی کے آگے برسوں زانوئے تلمذ تہہ کرنے کے بغیر ممکن نہیں تھا اور وہ موصوف کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہوئے قصور کے سوا کوئی ایسا مرکز نہیں ملتا جہاں اس کے لئے اس قدر کتابوں کا اور اتنے علوم میں سے بیشتر کا مطالعہ ممکن ہوتا کہ وہ دور قلمی کتابوں کا دور تھا جو جگہ جگہ دستیاب نہیں ہوتی تھیں۔ اس لئے شواہد کی کمی کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وارث شاہ نے اکتساب علم قصور ہی میں کیا اور چونکہ ان ایام میں وہی ایک خانوادہ اس سلسلے میں نمایاں تھا اس لئے اسی درس گاہ سے موصوف نے بھی اکتساب علم کیا ہو گا اور یوں مخدوم سے مراد حضرت غلام مرتضیٰ ہی ہے۔

کھڑل ہانس دے ملک مشہور ملکہ

قصور سے نکلنے کے بعد وارث شاہ کہاں کہاں گیا اور کیوں گیا اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ چنانچہ ایک سنی سنائی روایت یہ ہے کہ پہلے پاک پتن گیا اور پھر وہاں کے سجادہ نشین (مخدوم جہانیاں بقول چوہدری افضل حق) کے ہاتھ بیعت کی۔ بلاشبہ اس دور کا یہ دستور تھا کہ لوگ کہیں نہ کہیں بیعت ہوجاتے تھے اور یوں دینوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد باطنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بقول بعض وارث کا قصور سے پاک پتن کو چل دینا بغیر کسی حوالے کے بھی قبول کیا جاسکتا ہے۔

کسی تحریری یا معتبر سماجی حوالے کے بغیر وارث کو اس گاؤں کی مسجد میں ٹھہرا دینا اور وہاں بھاگ بھری کے آنے جانے کا تانا بانا بننا بڑی عجیب سی اختراع ہے اور اس پر الگ بات ہوگی۔ یہاں ہم اس دیس کو چلتے ہیں جس کا ذکر وارث نے یوں کیا ہے۔

کھڑل ہانس دے ملک مشہور ملکہ جتھے شعر کیتا یاراں واسطے میں

اور اختتام تصنیف کے بارے میں یوں اشارہ کیا ہے۔ سن ملیاں سو اسیاں بنی ہجرت لمے دیس دے وچ تیار ہوئی۔ لمے دیس سے پنجابی اردو لغت (مرتبہ و مولفہ تنویر بخاری) میں پچھم یعنی مغرب کی سمت مراد لیا ہے' پنجاب کا مغربی حصہ مراد لیا ہے' راوی اور بیاس کا دوآبہ مراد لیا ہے جو شاعر کے مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔ اسے یہ نام اس لئے دیا گیا تھا (اور صدر مقام لاہور کے باسیوں نے) کہ لم/لماں/لمو سے قدیم پنجاب میں نشیب یا ڈھلوان مراد ہوتا تھا بلکہ سندھی میں آج بھی اس کا یہی مطلب ہے۔

یہاں یہ بات بھی مزید تحقیق چاہتی ہے کہ "لمے دیے دے وچ تیار ہوئی"

سے کیا وہ پورا علاقہ مراد لیا جائے جو قصور سے نچلی جانب تھا یا صرف کھرل ہانس کا صدر مقام ملکہ مراد لیا جائے۔ یہ خیال اس لئے آیا کہ لماں بذات خود قدیم ایام میں مقاماتی نام تھا اور کنجاہ سے چند کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں پھتہ لماں ہے۔ اسی طرح ملکہ بھی لالہ موسیٰ کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے۔ اس کنج کاوی کی موضوع کے حوالے سے زیادہ اہمیت نہیں۔ بجز اس کے کہ اس سے یہ معنی لئے جائیں کہ وارث قصور سے نکل کر لے دیس میں جگہ جگہ قدم پیمائی کرتا رہا اور بالآخر ملکہ ہانس میں ممکن حد تک سکونت گزیں ہو گیا تھا۔

یہ بستی پاک پتن تحصیل میں ہے اور ساہیوال اور لاہور کے اضلاع کی حد اتصال سے چند کوس کے فاصلہ پر بتائی جاتی ہے کہ سردار قطب الدین اورنگ زیب کا شاہی اتالیق تھا جس نے علمی خدمات کے صلہ میں اسے یہ علاقہ جاگیر میں دیا تھا۔ وارث کے وقت یہ گاؤں نواب کھرل ہانس کی ملکیت تھا اور چونکہ پاک پتن سے چند ہی کوس دور تھا اس لئے ممکن ہے کہ وارث پاک پتن سلام کرنے کے بعد یہاں رک گیا ہو۔ کسی مسجد میں قیام کیا ہو اور وہاں حالات سے سازگاری کرتے ہوئے امامت بھی کرلی ہو۔

پروفیسر ضیا محمد صاحب نے "یادگار وارث" میں یہاں بیٹھ کر قصہ نگاری کی وجوہات یہ بیان کی ہیں --- (ا) وارث ٹھٹھہ جاہد (زاہد) میں مقیم تھا۔ وہاں ہی اس کے عشق کا ماجرا پیش آیا۔ لہٰذا وہاں ہی اس کو یہ قصہ لکھنے کی فرمائش ہوئی (اور بالفاظ چوہدری افضل حق بھاگ بھری کی جانب سے) (ب) وارث کا وطن جنڈیالہ شیر خاں اس زمانہ میں جنگ و جدل کا مرکز تھا اور قتل و غارت اور ناگہانی آفتوں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ کیونکہ وسطی پنجاب احمد شاہ ابدالی کے حملوں، سکھوں کی یورشوں اور سکھوں اور مسلمانوں کی باہمی آویزشوں سے میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ یکسوئی اور اطمینان قلب کا نام تک باقی نہیں تھا۔ ایسے حالات میں ادبی ترقی یک قلم بند ہو جاتی ہے اور علمی تصانیف بالکل ناممکن ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ہیر ایسا منظوم

عشقیہ شاہ کار اس علاقہ میں تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کوئی رزمیہ نظم ہوتی تو جذبات کا وقتی جوش و ہیجان شاید اس کے لئے مفید ثابت ہوتا (یادگار وارث ص ۱۲)۔

ہم اندازہ نہیں لگاسکتے کہ ان وجوہات میں سے کون سی وجہ حقیقی تھی اور یہ اندازہ لگانا ایسا ضروری بھی نہیں اگر ہم الحاقی گردان کر کتاب بدر کردیں اس مصرع کو جسے ضیا صاحب کے دور میں یعنی ۱۹۳۵ء تک غالباذات باہر نہیں کیا گیا تھا کہ "گوشے بیٹھ کیے ہیر کتاب لکھی" اڑ یاراں واسطے نال قیاس دے میں" تو تخلیق و تصنیف کے متعلق ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ وارث نے ساری داستان یہاں ہی بیٹھ کر لکھی تھی۔ ذہن اس طرف بھی جاتا ہے کہ وارث قصور سے نکل کر اس علاقہ میں یا ملکہ ہانس میں کئی سال تک رہا لیکن اگر اسے نہ بھی مانا جائے تو بھی اس بند کا پہلا مصرع جس پر تمام متفق ہیں ظاہر کرتا ہے کہ "روح قلبوں" کا یہ قصہ ادھر ہی مکمل کیا گیا تھا۔ میں نے لکھا گیا تھا کی جگہ یہاں مکمل کیا گیا لکھا ہے اور ذیل کی وجوہات کی بنیاد پر۔

قصور سے نکل وارث زیادہ دربدر رہا یوں اس داستان کی تکمیل کی طرف توجہ نہ دے سکا جسے اسنے جنڈیالہ یا قصور میں آغاز کیا تھا۔ قصور سے اس نے انداز" سکھوں کی یلغار کے ایام یعنی ۱۷۶۲ء میں بلکہ یورشوں کی گھٹاؤں کو اٹھتا دیکھ کر ہی نکل جانا مناسب خیال کیا ہوگا۔ جہاں وہ حسین خاں اور عبدالصمد خاں کے اس معرکہ کے بعد گیا ہوگا جو ۱۷۲۰ میں ہوا تھا اور جس میں حسین خاں مارا گیا تھا۔ چونیاں کے مقام پر ہونے والی اس لڑائی کے بعد ہم اس کی قصور میں آمد کو جتنا بھی موخر کریں یہ ایک حقیقت بنتی ہے کہ قصور میں وہ برسوں رہا اور جوانی کے جذباتی دن اس کے یا جنڈیالہ میں کٹے یا قصور میں اور اسی لئے خیال ہے کہ اس نے اسی زمانے میں "جب آتش جوان تھا" اس رومانی داستان کو لکھنا شروع کردیا ہوگا۔

جنڈیالہ اور قصور کے بعد لمے دیس کی جانب وارث کا سفر بالائی سطور کے

مطابق ہمارے خیال میں آفتاب عمر کے زوال آمادہ ہونے کے وقت ہوا ہوگا بلکہ زوال نصیب ہوجانے کے وقت اس کا احساس قارئین ہیر کو انہیں تاریخی حوالوں والے اشعار سے بھی ہوتا ہے اور باغ حیات کیے خزاں کی زد میں آجانے کے احساس سے بھی۔ مثال کے طور پر ہیر کا یہ مصرع کہ "سارے ملک خراب پنجاب وچوں مینوں وڈا افسوس قصور دا اے" اشارہ کرتا ہے کہ اسے ۱۱۷۹ھ میں لکھا گیا ہوگا کیونکہ اگر ۱۱۸۰ھ کو سال تکمیل داستان تصور کیا جائے تو یہ آخری حملہ بنتا ہے جس میں دیوالی کے میلے کے بعد قصور کو تاراج کیا گیا تھا اور چونکہ اس سے پہلے ہی اسے متعدد بار غارت کیا تھا اس لئے افسوس کا موقعہ یہی آخری حملہ ہوسکتا تھا۔ اسی طرح "دینا بیگ دے مگر جیوں ہٹے غلزئی ڈیرہ لٹ کے جا کنگال کیتو" میں درانوں کی آدینہ بیگ کے خلاف جس تادیبی یلغار کی طرف اشارہ ہے اس کا تعلق ابدالیوں کے پانچویں حملہ سے ہے جو اکتوبر میں کیا گیا اور پنجاب قندھاریوں کو مل گئی۔ یو مذکورہ بالا مصرعے والا بند بھی لے دیس میں لکھا گیا اور ۱۷۵۹ میں عیسوی کے بعد بلکہ "حکم ہوردا ہور اجے ہوگیا اج ملی نجات قندھاریاں نوں" والا بند بھی جو آدینہ بیگ والے بند سے کئی سو مصرعوں کے بعد آیا ہے۔

قصوری موزی کے حوالے والا ایک اور مصرع بھی ہے --- "جویں ساڑ قصور تے کھڈیاں توں اگاں خالصے جھوک و کھائیاں نیں" اور یہ حادثہ بھی ۱۱۷۹ھ کا ہے اور اسی بند کا یہ مصرع کہ "فوجاں شاہ دیاں وارثا مار متھرا ہن فیر لاہور نوں آئیاں نیں" ابدالیوں کی ۱۱۷۰ھ کی یلغار کی جانب اشارہ کرتا ہے اور چونکہ اس بند کا نمبر پ اب کی ہیر کے مطابق ۱۶۴ ہے اس لئے بالائی حوالہ ایک بالواسطہ ثبوت اس بات کا بن جاتا ہے کہ کم سے کم یہ بند بعد کی ساری داستان سمیت قصور سے چلے جانے کے بعد دیس میں لکھا گیا نیز یہ کہ وارث ۱۱۷۰ھ میں قصور چھوڑ چکا تھا۔ بلکہ اگر ہم اس کے ان اشعار میں جھانکیں تو شاید اس خیرباد کہنے کو اور پیچھے لے جانا پڑے۔

جدوں دیس تے جٹ سردار ہوئے گھرو گھری جاں نویں سرکار ہوئی
اشراف خراب، کمین تازہ، زمیندار نوں وڈی بہار ہوئی
چور چوہدری، یار نے پاک دامن، بھوت منڈلی اک تو چار ہوئی

کہ گھر گھر نئی سرکار قائم ہونے کا کاروبار پنجاب میں بارہ مسلوں کی تشکیل کے بعد شروع ہو گیا تھا یعنی ۱۷۶۲ عیسوی میں یا اس کے فوراً بعد جب ابدالیوں نے ہمیشہ کے لئے ان یلغاروں سے کنارہ کرلیا تھا اور یہ تاثرات بلکہ تلخ حقائق بھی قیاس ہے کہ لے دیس ہی میں قرطاس آشنا ہوئے ہوں گے۔

لیکن ان سب سے اہم سراغ در دست ہیر کے سراپا کا یہ مصرع ہے ---

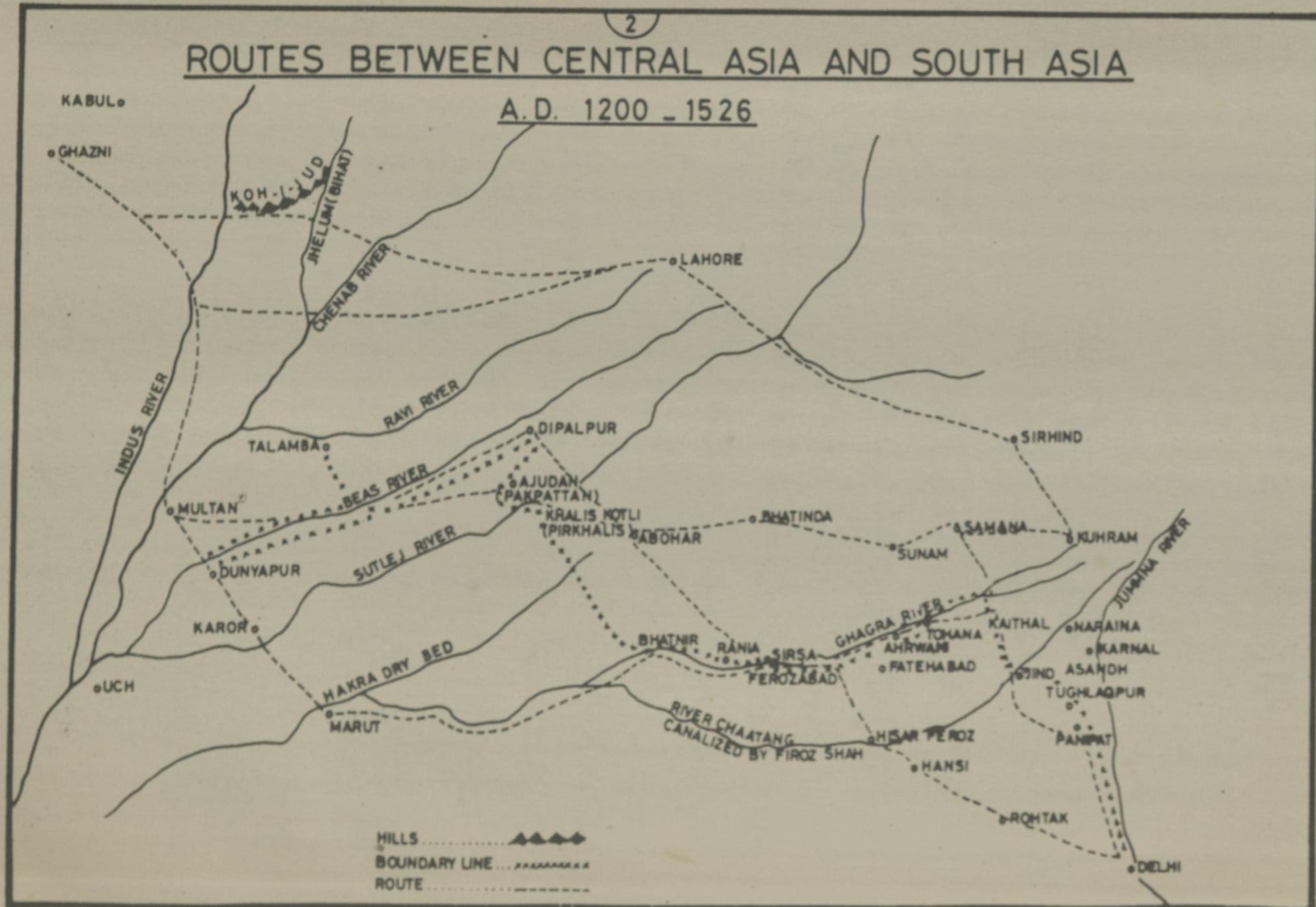
"قزلباش جلاد اسوار خونی نکل دوڑیا اڑو بازار وچوں"۔ یہاں میرے خیال میں لاہور کے اردوبازار کی طرف اشارہ ہے اور اس حادثہ خونی کی طرف جس میں : ت نامہ (جلد اول) کے مطابق لاہور ۱۱۶۰ہجری میں قزلباشوں یعنی ابدالیوں کا نشانہ ستم بنا تھا جب شاہ نواز خاں نے احمد شاہ ابدالی کے ایک غیر سرکاری سفیر صابر شاہ کے انداز گفتگو پر برہم ہو کر مروا دیا تھا۔ اس مصرعے کا ابتدائے داستان میں ہونا ایک تو اس گمان کو تقویت دیتا ہے کہ ان ایام میں وارث لاہور میں تھا اور شاید قصور جانے سے پہلے۔ دوسرے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اس نے اس داستان کو ۱۱۶۰ھ کے بعد لکھنا شروع کیا اور یہاں سے قصور چلے جانے کے بعد ایک اور مصرع میں بھی تاریخ سوانح اشارہ ملتا ہے کہ ڈیرہ بخشی دا مار کے لٹ لتا پائی فتح پٹھانی قصور دے نے" شریف صابر کے مطابق یہ ۱۷۶۲ء کا واقعہ ہے جب شہباز خاں نے سردار ہیرا سنگھ کو شکست دی تھی لیکن میرے خیال میں اشارہ نظام الدین خاں کی طرف ہے جس نے ۱۷۶۳ء (مطابق ۱۸۶۰ب) میں بھنگی سرداروں کا ڈیرہ راہ گزر لوٹ لیا تھا۔ (دیکھئے اولیائے قصور مرتبہ مولوی محمد شفیع صاحب)۔

اوپر سکھ مثلوں کا ذکر آچکا ہے اور وارث نے اپنے ایک مصرع میں ان مثلوں کے رویئے کایوں نقشہ کھینچا ہے ---"وارث شاہ جیوں دلاں پنجاب لٹی تویں جوگی

نوں لٹ اجاریوں نیں۔ یہ بند آدینہ بیگ والے بند سے قدرے پہلے ہے اور تاریخا" ۱۷۶۲ء سے قدرے بعد کا جب وہ دلیں تشکیل پذیر ہوتی ہیں۔ آدینہ بیگ والے بند میں ایک اور مصرع بھی قابل توجہ ہے کہ احمد شاہ وانگوں میرے مگر کپے کے پٹ ٹھڈ کے چک دا تال کیتو۔ اس کے متعلق شریف صابر نے وضاحت نامہ میں لکھا ہے کہ گیانی شمشیر سنگھ کے علاوہ کسی بھی مصنف نے اس کا ترجمہ دربار صاحب امرتسر نہیں کیا اور وضاحت نامہ کی طباعت سے معلوم ہوتا ہے کہ گیانی جی نے ہند کے چک لکھا ہے اور اسی بنا پر میں نے وضاحت کو ضروری جانا کہ خود مجھے بھی ہیر کا اردو ترجمہ کرتے وقت اس کا علم نہیں تھا کہ امرتسر کو پہلے گورو دا چک کہا جاتا تھا اور ابدالیوں نے ۱۱۷۷ھ میں (عبرت نامہ جلد اول) گورو کے چک کے تالاب کو مسمار کردیا تھا اور ہر چند عبرت نامہ میں گورو دا چک مرقوم نہیں ہے لیکن امرتسر گزٹ میں واضح طور پر لکھا ہے بلکہ بات کی ابتدا ہی اسی سے ہوتی ہے کہ امرتسر سے مراد فنائی کا تالاب ہے۔ یہ تالاب ابتدا میں پانی کا ایک خود نادہ "جوہڑ تھا جہاں بابا نانک اکثر (ادھر سے گزرتے ہوئے) بیٹھا کرتے تھے اور اسی حوالے سے اس آبادی کو جو بعد میں چوتھے گورو (رامداس) کے مستقل ڈیرہ لگادینے سے وہاں مزید ہوتی گئی گورو کا چک کہا جانے لگا۔ بعض بلاشبہ اسے رام داس پور بھی کہتے تھے۔ وقت گزرتے کے ساتھ جب وہ آب گاہ زیادہ سنواری سدھاری گئی تو ایک تالاب کی شکل اختیار کر گئی جسے امرتسر" کا نام دے دیا گیا۔ اگرچہ بعض کا کہنا ہے کہ گورو رام داس جی کے جانشین گورو امرو داس جی کے نام پر اس کا نام "امر تسر" پڑا جو بعد میں امرتسر بن گیا (پنجاب میں اب بھی اسے نہ امرتسر کہتے ہیں نہ امرتسر بلکہ امرسر" کہتے ہیں۔)

اس وضاحت کا مقصد ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے جس کا چند سال پہلے بھی شکار ہوا اور محترم شریف صابر صاحب بھی' بلکہ گیانی شمشیر سنگھ بھی۔ بلاواسطہ اس بند سے بھی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ اشعار وارث شاہ نے ملکہ میں بیٹھ کر لکھے

تھے اور یوں یہ بھی ترشح ہوتا ہے کہ ہیر رانجھا کی یہ داستان دیس میں آنے سے پہلے شروع کردی گئی تھی لیکن ناساعد حالات نے اسے جنڈیالہ یا ؟' میں مکمل کرنے کا موقعہ نہ دیا اور یہ کام اس نے بالاقساط اسے وقفے وقفے کے ساتھ لکھا۔



ROUTES BETWEEN CENTRAL ASIA AND SOUTH ASIA
A.D. 1200 - 1526

وارث شاہ اپنے آئینہ گفتار میں

غالب کا بڑا مشہور شعر ہے کہ ۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

لیکن بات شعروں کے انتخاب ہی کی نہیں شعر کہنے کی بھی یہی صورت ہے اور ہر شاعر اپنی داخلی تشنگی کی خارجی سیرابی کے حوالے سے لفظوں، ترکیبوں اور خیالوں کا انتخاب کرتا ہے۔ یعنی بیشتر غم جاں ہوتا ہے جسے غم جہاں بنا دیا جاتا ہے اور اسی لئے یاروں نے سوال کیا ہو یا نہ کیا ہو ہیر رانجھے کی داستان کو منظوم کرنا اپنا ایک جذباتی اشارہ رکھتا ہے۔ اس قصہ میں جو اس کا طبع زاد نہیں ہے ہم اس کی آپ کی گئی تبدیلیوں کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے بعض اضافوں کے اندر جھانکتے ہیں۔

وارث سے پہلے پنجابی میں اس داستان کو دمودر، چراغ اعوان، احمد گجر، اور مقبل نے منظوم کیا یا یوں کہہ لیجئے کہ زیادہ زبان زد انہیں کے قصے ہوئے۔

ان تمام قصوں کے مطالعہ سے ۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے فارسی میں لکھے گئے قصے ہیں باقی کولابی نے رانجھے کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا باپ مر چکا تھا۔ وہ اس کے بھائی ہونے نہ ہونے کی بات نہیں کرتا اور نہ اراضی پر پیدا ہونے والے باہمی جھگڑے کی۔ ہاں ادھر ضرور اشارہ کرتا ہے کہ ۔

در آرزوئے جمال نیکو
بودے دل دردمند دحیدو

اور ہیر کے جمال کی بات کہیں سے سن کر۔۔۔ نادیدہ بہیر گشت شیدا۔ ماں اسے سمجھاتی ہے لیکن وہ نہیں مانتا اور اس نادیدہ' کی طلب و تلاش میں چل پڑتا ہے۔ ایک ویرانے میں اسے خدا کے پانچ بندے مل جاتے ہیں جو اسے ایک "بے شیر" بھینس دوہنے کو آزمائش کے طور پر کہتے ہیں اور اس کے ایسا کر دکھانے پر اسے بھی روحانی خمیر والا جان کر اس کی دل جوئی کرتے ہیں کہ۔

غمگیں تو شود بود و نابود
کافر تو رسی بجملہ مقصود

ان کے چلے جانے کے بعد دھیدو ہیر کے شہر از خود پہنچ جاتا ہے اور خود ہی ہیر کے باپ چوچک کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ وہ اسے گھر لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ۔ محا باش مرا بجائے فرزند۔ دارم چو تو من دوسہ جگر بند۔ دھیدو کو وہ ڈھور ڈنگر چرانے کا کام سونپ دیتا ہے۔ اس کے حسن کی بات ہیر تک بھی پہنچ جاتی ہے جو ایک دائی کی وساطت سے اسے ملنے لگتی ہے اور وہ تاعمر نبھانے کے قول قرار کرتے ہیں لیکن باتیں اڑیں تو دھیدو شہر چھوڑ گیا۔ دائی کو اس کے پیچھے بھیجا گیا تو محسوس کیا کہ ازدیدہ کے باوجود وہاں ازدل دور والا معاملہ نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو خوابوں میں ملتے ہیں۔ خواب میں ہی ہیر اسے لوٹ آنے کو کہتی ہے اور وہ دریا کے کنارے ڈیرا لگا دیتا ہے۔ ملاقات ہوتی ہے' عہدو پیمان کی تجدید ہوتی ہے لیکن دوسری جانب ہیر کا حسام الدین نامی ایک شخص سے نکاح پڑھا دیا جاتا ہے۔ دونوں پریشان ہوتے ہیں لیکن بغاوت نہیں کرتے۔ البتہ ہیر کی سماجت پر ماں دھیدو کو بھی جہیز کے ہمراہ روانہ کردیتی ہے۔ رات کو قربت کے وقت ہیر خاوند کو کراری سی رسید کرتی ہے۔ یوں بدمزگی پیدا ہوجانے کے بعد ہیر میکے آجاتی ہے۔ بعد میں خاوند اسے منانے جاتا ہے۔ تو ہیر کورا جواب دیتی ہے کہ ۔ جز رانجھے دگر کے نہ خواہم۔ حسام شاہ عادل کے پاس جاتا ہے۔ ہیر طلب کی جاتی ہے۔ جہاں

درباری مفتی اور قاضی اسے لعن طعن کرتے ہیں تو ہیر ترکی بہ ترکی سناتی ہے اور ان میں کیڑے نکالتی ہے۔ ہیر بہرحال خاوند کو مل جاتی ہے لیکن سسرال جاتے ہی بیمار ہوجاتی ہے۔ رانجھا جوگی بن کر وہاں جاتا ہے اور طبابت کرنے لگتا ہے۔ ہیر بھی اسی حوالے سے اس کے پاس جاتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو دھیدو ہے۔ باہم بھاگ جانے کے منصوبے بنانے کے بعد ہیر خاوند سے میکے جاکر چار دن کاٹ آنے کی اجازت لیتی ہے۔ حسام باتوں میں آکر اسے اجازت دے دیتا ہے لیکن میکے پہنچ کر ہیر کی پھر وہی ہٹ ہوتی ہے اور ماں کے نہ ماننے پر آخر رانجھے کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ چند دن بعد اچانک دھیدو فوت ہوجاتا ہے۔ ہیر بھی اپنی موت کے لئے دعا مانگتا ہے زمین پھٹ جاتی اور وہ بھی وہیں دب جاتی ہے۔

اس قصے میں چند باتیں توجہ طلب ہیں۔۔۔

(۱) چوچک کی جگہ اس میں ہیر کی ماں زیادہ بااختیار لگتی ہے۔

(۲) کیدو اور سہتی اس میں مذکور نہیں ہیں نہ تخت ہزارہ اور رنگپور اور جھنگ

(۳) دونوں ایک ہی قبر میں سماتے ہیں۔

اب ہم ہیر دمودر کی طرف آتے ہیں جو تقریباً" اسی دور کی تصنیف بنتی ہے (تھوڑے سے تقدم اور تاخر زمانی کے ساتھ)

اس میں پہلی بار جھنگ کا اور سیالوں کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ہیر کے خاوند کا کوئی نام نہیں بتاتا۔ اس کے باپ کا نام علی بتایا جاتا ہے۔ ہیر کے چار بھائی۔ ہیر ایک ایسی لڑکی ہے جسے پنجابی میں "کھڑکے والی" کہا جائے گا۔ وہ سمبلوں اور چدھڑوں کے ایک اتفاقی سامنے میں دانت کھٹے کردیتی ہے۔ دمودر لڈن کو بھی داخل داستان کرتا ہے۔ دھیدو کے تین بھائیوں کو اس کے دشمن جاں بھائی بتاتا ہے۔وہ چھ برس کا تھا کہ ماں چل بسی۔ اس کے باپ (معظم/موجو) نے اس کی منگنی یعقوب وڑائچ کے گھر کی ہی تھی کہ وہ بھی جاں بحق ہوا اور رانجھا بھائیوں سے جان کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے تخت ہزارے سے نکل پڑا۔ راستے میں ایک

گاؤں کی لڑکی اس پر ریجھ گئی لیکن وہ اس سے کنی کترا کر چناب کنارے آگیا۔ یہاں اسے پانچ پیر ملتے ہیں اور ہیر کو رانجھے کو وابستہ دامن بنا دیتے ہیں (پیش گوئی کے حوالے سے) بلکہ سپنے میں وہ ہیر کے پاس بھی جاتے ہیں اور اسے بھی کہتے ہیں کہ ہم نے دھیدو کو تیرے پلو سے باندھ دیا ہے۔ اسی دریا پر لڈن' پلنگ اور پھر ہیر سے واسطہ پڑتا ہے اور ہیر موہت ہو کر اسے کہتی ہے کہ وہ اس کے باپ چوچک کے پاس جائے جو اسے ڈھور چروانے کے لئے رکھ لیتا ہے۔ ڈھور اس کی بانسری سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ ہیر رانجھے کی بیلے میں ملاقاتیں ہونے لگتی ہیں اور نشر بھی ہوجاتی ہیں۔ چوچک تک بات پہنچتی ہے تو وہ اپنے بھائی کیدو کو دودھ پانی نکھیڑنے کے لئے کہتا ہے جو رانجھے سے جا کر چوری لے آتا ہے۔ ہیر اس پر بطور ردعمل کیدو کی جھگی کو جلا دیتی ہے۔ چوچک بھی رانجھے سے دل آزاد ہوتا ہے اور ہیر کی شادی کی راہ نکالی جاتی ہے اور ہیر کے انکار پر اسے زہر دینے کی تدبیر کی جاتی ہے لیکن زہر اثر نہیں کرتا۔ آخر کیدو ہی اسے زبردستی ڈولی میں ڈالتا ہے اور رانجھا بھی جہیزی سامان اٹھائے ساتھ جاتا ہے۔ ہیر کھیڑے کو قربت جوئی کے وقت تھپڑ رسید کرتی ہے۔ یہاں رانجھے کو مار دینے کے منصوبے بنتے ہیں جنہیں پانچ پیر ناکام بنا دیتے ہیں او رانجھا وہاں سے جھنگ اور پھر تخت ہزارے چلا جاتا ہے۔ بھائی روکھے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن یعقوب وڑائچ بھی وہاں پہنچ جاتا ہے جو رانجھے کے انکار پر اپنی بیٹی اس کے بھتیجے سے بیاہ دیتا ہے ادھر رنگپور میں ہیر کو ایک کوٹھڑی میں بند کردیا جاتا ہے۔ جہاں سہتی کی سازباز سے رانجھے کو پیغام بھیجا جاتا ہے اور وہ جوگی بن کر آجاتا ہے اور سانپ کے ڈسنے کے بہانے ملاقات ہوتی ہے اور ہیر رانجھے کے ساتھ نکل بھاگتی ہے۔ کھیڑوں کے تعاقب پر وہ ناہروں سے پناہ طلب ہوتے ہیں جن سے کھیڑے زور آزمائی کرتے ہیں اور آخر پنچایت بیٹھ کر کوٹ قبولے جانے کا فیصلہ دیتی ہے۔ جہاں ہیر اور قاضی دوبدو ہوتے ہیں جس میں ہیر واشگاف الفاظ میں کہتی ہے کہ۔۔میں تے رانجھے نیونہہ چروکا جاں صاحب

خلقت ساجی۔ یہی نہیں بلکہ وہ کہتی ہے۔۔۔اب نکاح ولاں دے بدھے توں کے بنیں قاضی۔

لیکن فتویٰ ہیر کے خلاف جاتا ہے۔ کھیڑے ہیر کو حاصل کر کے اسے پیٹتے ہیں ادھر کوٹ قبولے کے دروازے کو آگ لگ جاتی ہے۔ لوگ اسے غلط فیصلے کا نتیجہ گنتے ہیں اور خود قاضی بھی شاید۔ جو ہیر کو کھیڑوں سے واپس لے کر رانجھے کو دے دیتا ہے۔ وہاں سے نکلنے پر انہیں پھر پانچوں پیر ملتے ہیں اور پھر۔۔۔"آکھ دمودر چھپے کتھائیں، گئے مو فیر نہ آئے"۔ یعنی وہ ان کے کدھر چلے جانے کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کرتا۔ ہاں حاصل کلام یہ بتاتا ہے کہ۔۔۔جبوں چائی تیوں توڑ تباہی جانت ہے ترلوٹی۔

لیکن کیدو کے حوالے سے قصے کی جانب بڑھیں تو وارث شاہ کا قصہ مجھے شاہجہانی دور کے ایک قصے "افسانہ دلپذیر" کے زیادہ قریب لگتا ہے۔ اس کے مصنف سعید سعیدی جہاں یہ گپ ہانکتا ہے کہ۔

از کس نشنیدم ایں حکایت (یہ کہانی میں نے کسی سے نہیں سنی)
در طبع کشیدم ایں روایت (یہ روایت میری طبع زاد ہے)

وہاں کیدو کو اس نے اسی طرح پینٹ کیا ہے جس کی جھلک ہمیں مقبل اور وارث کے ہاں ملتی ہے اور جس طرح چوچک کا پہلا ردعمل بالفاظ وارث یہ ہے کہ "کوڑیاں کریں گلاں، ہیر کھیڈ دی نال سہیلیاں دے" اسی طرح سعیدی بھی کہتا ہے کہ چوچک پہلے کیدو کی بات کو سنی ان سنی کردیتا ہے لیکن جب اس کی جھگی نذر آتش کردی جاتی ہے تو کیدو بے قابو ہو کر اس کی ماں کے آگے فریادی ہوتا ہے جو اس کو مکان بند کردیتی ہے لیکن ہیر پر اس پابندی کا اثر نہیں ہوتا اور وہ رانجھے سے ملتی رہتی ہے اور ایک دن خود چوچک بھی دیکھ لیتا ہے۔ خود دیکھ لینے والی یہ بات قیاس ہے کہ ہیر وارث سے پہلے کے حصوں میں نہیں ہوگی اور یوں

لگتا ہے سعیدی ہی سے متاثر ہو کر بعد میں بڑھا دی گئی ہوگی کیونکہ یہ مقبل نہیں کہتا اور نہ احمد گجر کہتا ہے۔ سعیدی نے دیکھ لینے کی بات کو زیادہ سلیقہ مندی سے پیش کیا ہے اور شرفا کے رویئے کے مطابق کہ جب چوچک ہیر کو رانجھے کے ساتھ لیٹے ہوئے دیکھ لیتا ہے تو اپنا تازیانہ وہاں پھینک آتا ہے جسے ہیر پہچان کر رانجھے کو ہزارے نہ جانے کا مشورہ دیتی ہے جسے وہ قبول نہیں کرتا کہ بھائیوں کے رویئے سے آگاہ تھا اور شاید ردعمل سے بھی لیکن وہ کسی طرف چل دیتے ہیں اور جب بھائی پیچھا کرتے ہیں تو وہ رانجھے کو ادھر ادھر کر کے خود بھائیوں کے ساتھ چل پڑتی ہے۔ یہاں سعیدی بھی وہی کہتا ہے جو دمودر نے کہا تھا اور جو وارث نے کہا کہ ---"منگو چھڑن نہ باجھ رنجھیڑے دے" اور ہیر کے بھائی ہی اسے جاکر لے آتے ہیں۔ ہیر پھر اسے ملنے لگتی ہے تو بھائی رانجھے کو ماردینے کی سوچتے ہیں لیکن جب اس پر تلوار اکائی گئی تو وہ خواجہ خضر کے بروقت آجانے سے اٹھی کی اٹھی رہ گئی (سعیدی نے پانچ پیروں کی جگہ خواجہ خضر سے رانجھے کی ملاقات کرائی تھی جنہوں نے کہا تھا کہ ہیراست کہ باتو دادم اے مرد)۔

(اے شخص میں نے ہیر تجھے دے دی)

بعد کی داستان تقریباً" وہی ہے جو وارث نے بیان کی ہے۔ وہی بھاگنا' پکڑا جانا قاضی کے آگے پیش ہونا۔ ہاں سعیدی کہتا ہے کہ قاضی نے ان دونوں کو ایک سال اپنے ہاں شہر میں رکھا۔ پھر رانجھا بیمار ہو کر راہی عدم ہوا اور اس کے بعد ہیر بھی لیکن ایک قبر میں مدفون نہیں بلکہ ۔ آں ہر دو مزار متصل شد - کہاں؟ سعیدی خاموش ہے۔

اسی طرح عالمگیری دور کے ایک اور شاعر لائق جونپوری نے بھی اس حصے کو نظمایا تھا اور اعتراف کیا تھا کہ -- این نکتہ ز خاکیاں شنیدم (میں نے یہ بات مقامیوں سے سنی تھی) وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کس بزبان ہندستہ' (کسی نے اسے

مقامی زبان میں موزوں کیا تھا) اور چونکہ پنجابی کو پہلے ہندی یا ہندوی بھی کہا جاتا تھا اس لیے قیاس ہے کہ اس کا اشارہ دمودر کی جانب ہے۔ اس قصے میں لائق جونپوری وارث کی طرح ہی کہتا ہے کہ چوچک کے پاس رانجھے کو ہیر ہی لے کر گئی تھی۔ کیدو کو لائق ہی نے بلائے یک پا یعنی لنگا کہا ہے وارث نے تو اس سے پہلے مقبل نے بھی یہ بات اس سے لی ہوگی۔ لائق ہی نے ہیر کی نند کو شامل داستان کیا ہے اس نے نام مشہدی بتایا ہے جو کتابت یا سماعت کی غلطی ہو سکتی ہے۔ لائق بھی دونوں کو ایک ہی قبر میں ملاتا ہے۔ اسی عہد میں حکیم چنابی نے بھی (۱۱۱۰ھ میں) اس قصہ کو منظوم کیا تھا اور اسے کوٹ کمالیہ میں ختم کیا تھا جہاں کے سردار محبت خاں نے اسے بہت پسند کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ محبت کھرل تھا اور سیالوں سے ان کی بنتی نہیں تھی جو ایک محرک تصنیف قصہ کا بنا ہوگا اور راقم کے خیال میں وارث کا ملکہ ہانس میں اسے لکھنا بھی شاید ہی سیاسی پس منظر رکھتا ہو۔

چنابی کی یہ بات قریب فطرت و تربیت لگتی ہے کہ جب ہیر رانجھے کو دیکھ کر اس پر فدا ہو جاتی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی سوچتی ہے کہ میں ایک رئیس زادی ہوں اسے ساتھ لے کر جانا مجھے زیب نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ رانجھے کو کہتی ہے وہ دو دن بعد خود آجائے اور وہ چوچکانے آگیا۔ چنابی بھی کہتا ہے کہ ہیر نے ماں سے بہن باپ سے رانجھے کے بارے میں کہا تھا۔ چنابی یہ بھی کہتا ہے کہ ہیر کا دل رسموں رواجوں میں سے گزرنے کا نہیں تھا لیکن ماں کے کہنے پر کہ "خود را و مرا مسا زید نام" وہ چپ ہوگئی اور قاضی کے ساتھ تلخ و ترش کہنے کے بعد ہار مانتے ہوئے بالفاظ چنابی ۔

داد آں چہ در اختیار او بود۔ جان و دل ملک یار او بود

(جو کچھ اسے دینے کا اختیار تھا اس نے دے دیا۔ بجز جان و دل کے جو اس کے یار کی دولت تھے)

چنابی ہی نے ٹلہ جوگیاں کو قصہ میں متعارف کروایا ہے اور یوں لگتا ہے کہ وارث شاہ نے یہ اضافہ اسی کے زیرا اثر کیا تھا۔ اسی طرح چنابی کہتا ہے کہ کوٹ قبولے کے حاکم نے فریقین میں صلح صفائی کروادی تھی اور رانجھے نے جوگیانہ لباس اتار دیا اور دونوں کھیڑوں کے ساتھ ان کے پاس آگئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ماہی یعنی رانجھا وطن کے لیے جی اداس ہوا۔ وہ ہیر سے رخصت لے کر ہزارے جاتا ہوا بیمار ہو کر راہی عدم ہوا اور بقول چنابی ۔

کروند مزار آں دل آرا	درد یہ کلاس نام' آنجا
اس دل آرا کا مزار بنایا گیا	کلاس نامی گاؤں ہے جہاں
باشہر من آں وہ ہست ہم نام	بالا چناب دارد آرام
اس گاؤں کا اور میرے شہر کا	وہ وہاں چناب کے کنارے محو
ایک ہی نام ہے	آرام ہے ۔

ہیر کو پتہ چلا تو وہ بھی اسی راہ فنا پر چل دی اور اسے چوچکانہ میں دفن کیا گیا لیکن وہاں کے حاکم کو ہیر نے خواب میں مل کر کہا کہ مجھے جھنگ میں دفنایا جائے۔ چنانچہ اسے وہاں لے جا کر دفنا دیا گیا۔

یوں دیکھیں تو یہ حصہ ایک آپ ٹھارے برساتی نالے کی طرح سے سے میں اور شاعر شاعر کی ترنگ یا شنید اور تمنا کے مطابق رنگ اور راستے بدلتا آیا ہے اور اسی لئے ہم کچھ نہ کچھ ان تبدیلیوں کے روزنوں میں سے جھانک کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان تبدیلیوں کے محرکات کیا تھے۔ جو بیشتر ذاتی اور داخلی ہوں گے کہ کسی شاعر کو بھی کوئی ایسی خارجی مجبوری نہ تھی کہ کہانی کو ضرور ہی وہ رنگ دینا ہے جو اس کو دیتے ہوئے ہم پاتے ہیں اور آج ہر چند ہیر کا جنگ میں معتبر نزاع فکری کا باعث بنا ہوا ہے لیکن راقم الحروف کے خیال میں یہ اسی قدر فرضی داستان ہے جس قدر اور بے شمار لوک داستانیں۔ دوسرے سادہ نقطہ نظر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ہیر دمودر (مطبوعہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور) کا محمد آصف خاں صاحب

کا لکھا ہوا دیباچہ اور بلال زبیری صاحب کی تصنیف "تذکرہ اولیائے جھنگ" کا مطالعہ مفید رہے گا۔

ہمارے موضوع کے حوالے سے کہانی کے بنیادی کردار دو ہیں۔ ہیر رانجھا ان میں سے دمودر اور دوسرے قصہ نگاروں نے ہیر کے حسن و جمال کی اسی قدر بات کی ہے جس قدر مناسب تھی بلکہ مقبل نے اس پہلو کی کوئی بات نہیں کی۔ جب کہ وارث نے اس کی آرائش اور اس کے حسن کی تعریف میں ۳۵ مصرعے کہنے ضروری خیال کیے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے وہ اشعار ہیر جو ان کے لب پر ہیں اور وارث کی اس سراپا نگاری نے بعد کے داستان طرازوں کو اس کی تقلید پر جیسے مجبور کردیا اور ہر کسی نے داستان کی ہیروئن کے جمال کی تعریف کو ضروری جانا۔

ہوٹھ سرخ یاقوت جیوں لعل چمکن، ٹھوڈی سیب ولایتی سار وچوں
نک الف حسینی دا پیلا سی، زلف ناگ خزانے دی بار وچوں
دند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی، دانے نکلے حسن انار وچوں
کھلی چین کشمیر تصویر جٹی، قد سرو بہشت گلزار وچوں
گردن کونج دی انگلیاں روا پھلیاں، ہتھ کولڑے برگ چنار وچوں
باہاں ویلنے ویلیاں گنہ مکھن، چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں
چھاتی ٹھاٹھ دی ابھری کٹ کھنوں، سیب بلخ دے چنے انبار وچوں
دھنی بہشت دے حوض دا مشک قبہ، پیڈو مخملی خاص سرکار وچوں
کافور شمشاد سرین بانکے، حسن ساق ستون مینار وچوں
سرخی ہوٹھ دی لوڑھ دندا سڑے دا، خوجے کھتری قتل بازار وچوں
شاہ پری دی بھین پنج پھول رانی، گجھی رہے نہ ہیر ہزار وچوں
ابرادھ تے اودھ ولٹ مصری، چمک نکلے میان دی دھار وچوں
پھرے چھنکدی چاء دے نال جٹی، چڑھیا غضب دا کٹک قندھار وچوں

لنک باغ دی پری کہ اندرانی، حور نکلی جیبے دی دھار وچوں
تپلی پکھنے دی نقش روم والے، لدھا پری نے چند اجار وچوں
ایویں سرکدی آوندی لوڑھ جٹی، جویں کونج تر نکلے ڈار وچوں
متھے آن لگن جیہڑے بھور عاشق، مشکل جان تلوار دی دھار وچوں
عشق بولدا نڈھی دی تھاؤں تھاؤں، راگ نکلے زیل دی تار وچوں
جو کوئی و یکھدا اوس دے حسن تائیں، زخم لگدا اوس تلوار وچوں
وارث شاہ جاں نیناں دا دا لگے، بچے کوئی نہ جوئے دی ہار چوں

ان اشعار کا قصے کی چال سے بظاہر کوئی تعلق نہیں اور جہاں دوسروں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی وہاں وارث کا یہ اضافہ (فارسی مثنوی نگاروں کے تتبع میں ہی سہی) ایک اشارہ بنتا ہے کہ وارث کا مزاج ذکر جمال سے لذت گری ہونے والا تھا۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ یہ مزاج ہمارے بعض غیر محتاط عناں گستہ لمحات میں تلذذ جنسی کے قریب بلکہ بہت ہی قریب جا پہنچتا ہے اور شاید اسی بنا پر ہم وارث کو جہاں اسے موقع ملا ہے اس موضوع کے "ذکر رنگین" میں ڈوبتا پاتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے جگہ جگہ مواقع پیدا کیے ہیں۔ چنانچہ "شناوری کردن ہیر رانجھا در دریا مع سہیلیاں" والا سارا بند اضافہ ہے اور محض اس لئے کہ اس بہانے اختلاط و ارتباط کی کیفیت کے بیان سے لذت گیری کی جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشعار میں تشنہ کاموں کے لئے ایک کشش اور ایک چسکا موجود ہے۔

اوہ ونجھلی نال سرود کردا، اوہ نال سہیلیاں گاوندی اے
کائی زلف نچوڑدی رانجھے تے، کائی آن گلے نال لاوندی اے
کائی چمبڑے لک نوں مشک بوری، کائی مکھ توں مکھ چھہاوندی اے
کائی "میریاں" آکھ کے بھج جاندی، مگر پوے تاں ٹھیاں لاوندی اے

کائی آکھدی ایدے آ رانجھیا وے، مار باہلی یار نوں دھاوندی اے
مڑدے تاریاں چغال لے کے، کوئی نول نسل رڑھی آوندی اے
کتے تاریاں ترن چوا کرکے، اک چھال گھڑم دی لاؤندی اے
ہیر ترے چو طرف ہی رانجھے دے، موری مچھلی بن بن آوندی اے
ایس تخت ہزارے دے ڈنبھرے نوں، رنگ رنگ دیاں جالیاں پاؤندی اے
وارث شاہ جٹی ناز نیاز کرکے، نت یار جیو ہر جاوندی اے

اس سے انکار نہیں کہ جب برات چڑھ آتی تھی تو لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں فحش گوئی کا اظہار کرتے تھے لیکن کسی داستان میں ان کو بہرحال شامل کرنے والے کے مزاج کا عکاس ضرور ہوتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ اس حمام میں صرف وارث شاہ ہی ننگا ہے۔ بہت سے اور بڑی محتاط زندگی بسر کرنے والے بھی ہیں۔

ب۔ اب ہم رانجھے کی طرف آتے ہیں۔ اس داستان کے پنجابی روپ میں تقریباً سارے شاعر متفق ہیں کہ بھائیوں سے بگاڑ تخت ہزارے سے کوچ کا باعث بنا اور یہ بگاڑ باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا لیکن جہاں دمودر یہ کہتا ہے کہ اس نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ بھائی اسے جان سے مار ڈالیں گے ترک وطن ہی میں عافیت جانی --- "جندو دے بھوار ابھی ہویا" کے بعد وہ بالفاظ دمودر کہتا ہے کہ قیمت نپ چلایا اور آگے چل کر اپنے ایک میزبان کو بتاتا ہے کہ زیارت کر آواں پیراں دی، رہاں اتے جائی لیکن آگے چل کر لب آب وہ بانسری بجاتا ہے تو پیر سن کر وہاں آن پہنچے اور انہوں نے خوش ہو کر ہیر رانجھے کو بخش دی اور یوں اسے عازم جھنگ بنادیا۔

تمام نسخوں میں "گل بھائیاں ایہ بنا چڈی مگر جٹ دے پھکڑی لائیے جی، درجے ہے کین موہن سنگھ نے بھلیاں لکھا ہے اور میں نے اسے اس لئے ترجیح دی ہے کہ ایسے کام بھاوجوں کا رویہ گنے جاتے ہیں اور اگر بھائیوں کی طرف یہ

الزام لوٹا ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مقبل کہتا ہے --- نین ہیر دی خواب وچ ذبح ہویا' بھیت کسے نوں مول نہ دسدا سی اور یوں بھائیوں سے ناخوش ہو کر وہ خواب اس کے لیے تحریک سفر بنا۔ دمودر کے واضح اشارے اور مقبل کے خفیف سے اشارے کے درمیان وارث نے تیسری راہ نکالی کہ بھائیوں سے زیادہ بھائیوں نے سوچا کہ اس کے دامن ہر کوئی داغ لگا کر اسے ترک وطن پر مجبور کردیا جائے لیکن جہاں باقیوں نے دوچار مصرعوں میں اس بات کو ختم کردیا ہے وہاں وارث نے اسے ایک سو سے زیادہ مصرعوں تک طول دیا ہے اور یہی طول کلام میرے اس قیاس کا باعث بنا ہے کہ رانجھے اور وارث کا ترک وطن یکساں حالات کا پیدا کردہ تھا اور شاید دونوں ہی اپنے دور کے مطابق مختتی نہیں تھے اور نہ وقت سے سمجھوتہ کرجانے والے۔ ورنہ جس مسئلے سے دہیدو دوچار ہوا تھا وہ تنہا اسی کا مسئلہ نہیں تھا اور بھائیوں کی ناانصافی پر ہی کوئی گاؤں چھوڑ کر تو نہیں چل دیتا۔ ہاں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہیر مقبل میں بھابیوں کی بیگانہ روی یا دشمنی نہیں پائی جاتی بلکہ وہ اس کا بھتہ لے کر کھیتوں پر جاتی ہیں۔

ے

رانجھا مڑدیاں نظر جو آیو نیں' اک جھاڑی دے مڈ بے حال پیا
پیر نپ کے آن جگایو نیں' رانجھے اٹھ کے رب دا نام لیا
رانجھا حال تھیں بہت بے حال ہویا' مصر جائیاں دے من پئی دیا
ہائے بھائی مٹھی کر پچھیو نیں' تیرے باپ کی مقبلا ورت گیا

اور ے

درد مند رانجھا بھر جائیاں توں' رو روائیا حال سناوندا اے
سنگ کھاونا اساں قبول کیتا' ساتھوں کم نہ سانبھیا جاوندا اے
میری پناہ خدا ہے بھابیونی' میرا جیو نہ مول دھراوندا اے

مقبل مال متاع نوں بھاہ لگے سانوں، فقر فاقہ خوش آوندا اے

ادھر دمودر جب بھابیوں کا ذکر تک نہیں کرتا تو بھائیوں اور بھابیوں کے خلاف ظاہر کیے گئے ردعمل کو وارث کی اپنی سرگزشت گردانے کی طرف ذہن مائل ہوتا ہے ان میں سے بھی بھابیوں کو سرفہرست اس لیے اوپر دکھایا گیا ہے کہ رانجھا کہتا ہے -- بھائی ساک سن سوتساں وکھ کیسے، سی ساک کی ساڈیاں لگدیاں او۔

(ج) اب ہم داستان کے ایک اور ابتدائی کردار لڈن کی طرف آتے ہیں جو دمودر کے مطابق دھیدو کو دیکھتے ہی بک گیا تھا۔۔ ویکھدیاں وکانا جھیور اور پھر -- دے ؟؟ برخوردار را، پچھوں کدوں آیا ؟ یہ لڈن یہاں تک اس کا یا اس کے سرود کا فریفتہ ہوجاتا ہے کہ کہہ اٹھتا ہے ۔ منگو! مجھیں تے دو عورتاں میں دیواں تیں تائیں"۔ رانجھا ان سب کی جگہ اس سے دو گھڑی پلنگ پر سو لینے کی اجازت چاہتا ہے اور انکار پر کہتا ہے کہ --- منجے اتے سون نہ دیویں، رناں مجھیں، کیکن دیندا" اور ناراض ہوکر جب چل دیتا ہے لڈن اسے جاکر پکڑلیتا ہے اور ہرچہ مادا باد کہتا ہوا اسے پلنگ پر سلادیتا ہے اور اس کی سزا بھی بھگتتا ہے۔

اسی طرح مقبل کے مطابق لڈن پار کنارے سے رانجھے کو دیکھ کر اس کا مشتاق ہوجاتا ہے اور اس کو دریا پھسلنے سے منع کرتا ہے اور کشتی لے کر اس کے پاس پہنچ جاتا ہے کہ وہ ہیر کا ہے تو اسے (اپنے خواب کے حوالے سے) خوشی ہوتی ہے لیکن لڈن دھیدو کی اس پر آرام کرنے کی التجا پر افسردہ ہوتا ہے۔ اگرچہ بعد میں مان جاتا ہے اور سزا بھگتتا ہے۔

اب ہم وارث کی طرف آتے ہیں۔ لڈن کا پہلا ہی تعارف وارث یوں کرواتا ہے -- "وارث شاہ میں لڈن وڈھی کین" اور پھر اس درخواست پر کہ مجھے پار مفت لے چل (یعنی خدا کے نام پر) وارث کا لڈن غلیظ الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہتا کہ "بیڑا ٹھیلدے لب دے واسطے تے" اور بات کو مزید بڑھاتے ہوئے کہتا

ہے ۔

پیسہ کھوہل کے ہتھ جے دھریں میرے، گودی جا کے پار اتار ناں ہاں
اتے ڈھیکیا مفت جے کن کھائیں، چا سبزیوں زویں تے مارناں ہاں
جیہڑا کپڑا دے تے نقد مینوں، سبھوں اوس دے کم سوارنا ہاں
زوراوری جے بیرے تے آن چڑھے، ادھ وارڑے ڈوب کے مارناں ہاں
ڈاماں، اتے فقیراں نے مفت خوراں، دوروں کتیاں وانگ درکارناں ہاں

اور یہ لڈن نہیں بول رہا وارث بول رہا ہے۔ اس کا تجربہ بول رہا ہے۔ بلاشبہ ملاح ویسے بھی ہوتے ہیں جیسے مقبل دکھلاتا ہے اور ویسے بھی جیسے وارث نہیں کرتا ہے اور دونوں نے آدھے آدھے لڈن پیش کیے ہیں اپنے اپنے زلغ قلبی کے مطابق۔ یعنی وارث کے اندر ایک کج بینی یا کج رائی سی ملتی۔

(د) اسی کج بینی اور کج رائی کا اظہار ملاح کے ساتھ اس کے واسطہ پڑنے سے ہوتا ہے۔ مع واسطہ وارث کا طبع زاد نہیں ہے اسے دمودر سے ملا ہے۔۔

ادھی رات اٹھ چلیا دھیدو، پلے خرچ نہ پایا
تراہ جند دا اندر دھیدو، رہے نہ مول رہا یا
کھنڈی تے ہتھ نجھلی کیتی رات معینے آیا

لیکن دمودر کسی ملاں سے اس کا سامنا نہیں کرواتا۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات سمائی ہوئی ہے کہ ہر کہیں عورتیں اس پر فدا ہوتی ہیں اور وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔

مقبل اس ملاقات کی کیفیت یوں پیش کرتا ہے ۔

پنڈ پہنچیا جاکے چھاہ ویلے، رانجھے راہ دے وچ میت ڈٹھی
پڑھن پاس استاد دے کئی لڑکے، شہزادیاں سوہنی چھب مٹھی

کوئی پڑھے قصہ کوئی نظم واچے، کوئی پڑھے تے لکھے پٹی
مہربان ہویا رب مقبلے تے، جس عشق حقانی دی بات سٹھی
ہتھ بنھ کے ملاں نوں کرے کورنش، رانجھا وچ مسیت دے جامیاں
ملا آکھیا کہڑا ہیں جوندا رہ، شطرنجیاں تے بیٹھ آ میاں
کھرا وسدا رنگ بغیر تیرا، سانوں اپنا حال سنا میاں
آکھ مقبلا کدھروں آیا ایں، اگے جاونا ایں کہڑے رہ میاں
کہندا نام دھیدو، میری ذات رانجھا، شہر تخت ہزاریوں چلیا میں
بھکھیاں وچ اجاڑ دے رات کٹی، دتا رب دا سر تے جھلیا میں
میرا جیو ہویا ملک ویکھنے نوں، پھراں مست اداس اٹھ چلیا میں
پانی ایس گراں دا پیونا سی، تیتھے مقبلا رب نے گھلیا میں

اب ملاں کا جواب سنئے۔

تاکید کر کے ملا لڑکیاں نوں، گھریں بھیجیا طعام لیاونے نوں
جا آکھیا لڑکیاں مایاں نوں، اٹھ لگیاں طعام پکاونے نوں
گھروں تھال پر یہہ کھنڈ چاولاں دا، مقبل لیائے سی ہیر مناونے نوں

اس کے بعد۔

ملاں آکھیا رانجھے نوں مہر سیتی، ہتھ دھوتے بیٹھ کے کھا کھانا
ہتھ دھو کے ملا دے نال بیٹھا، کھا دا رانجھے نے جتنا من بھانا
کھانا کھا کے ملاں تو وداع ہویا، کہندا جھنگ سیالاں نو اساں جانا
مقبل کوس اجوکڑی رات ایتھے، ملا آکھیا رانجھا ہو سیانا
حکم ملا دا رانجھے من لیتا، بیٹھا وچ مسیت دے مار تھانا
رانجھے ملاں دے باب دعا کیتی، ثابت رہوے ایمان بہشت جانا

اور پھر رات کو وہاں قیام کر کے فجر کے وقت رانجھا وہاں سے چل دیتا ہے۔
اب وارث کے ملاں کا اور دھیدو کا رویہ دیکھیے رانجھا بھائیوں اور بھابیوں

سے قطع تعلق کر کے جھنگ سیال کو چل دیتا ہے۔

بھکھے ننگ نوں چھاگ کے پندھ کر کے، راتیں وچ میت دے آیا اے
ہتھ ونجھلی پکڑ کے رات ادھی، رانجھے مزہ وی خوب بنایا اے
رن مرد نہ پند وچ رہیا کوئی، سبھا گرد مست دے آیا اے
وارث شاہ میاں پنڈ بھگڑیاں دی، پچھوں ملا میت دا آیا اے

بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ اگر کسی دور میں بھی کسی گاؤں کی مسجد میں کوئی پردیسی آدھی رات کو آن کر بانسری بجانے لگے تو وہاں کے ملا کا رد عمل کیا ہوگا اور اگر وہ مسجد اسی قسم کی ہو جس قسم کی وارث شاہ نے بتائی ہے کہ ۔

مسجد بیت العتیق مثال آہی، خانے کعبیوں ڈول اتاریا نیں
گویا اقصیٰ دے نال دی بھین دوئی، شاید صندی نور اساریا نیں

تو وہاں کے ملا کا یہ اخلاقی، سماجی اور مذہبی فریضہ بنتا تھا کہ وہ وہی کہے جو وارث نے اس کی زبان سے کہلوایا ہے۔

ملاں آکھیا، چوندایاں ویکھدیاں ای، غیر شرع توں کون ہیں ڈور ہو اوئے
ایتھے لچیاں دی کوئی تھاں ناہیں، پٹے دور کر حق منظور ہو اوئے

اور اب رانجھے کا جواب سنئے اور یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اس نے آدھی رات مسجد میں بانسری الاپنی شروع کر دی تھی ۔

داڑھی شیخ دی عمل شیطان والے، کہا رانیوں جاندیاں راہیاں نوں
اگے کڈھ قرآن تے بہیں منبر، کہیا اڈیو مکردیاں پھاہیاں نوں
وارث شاہ وچ حجریاں فعل کردے، ملاں جو ترے لاوندے واہیاں نوں

ایک بار پھر ملا کی بات سنئے۔

گھر رب دے مسجداں ہوندیاں نیں، ایتھے غیر شرع نہیں واڑیے اوئے
کتا اتے فقری پلیت ہووے، نال دریاں دے بھ ماریئے اوئے
تارک ہو صلوۃ دا پٹے رکھے، لبا والیاں مار پچھاڑیئے اوئے
نیواں کپڑا ہو وے تے پاڑ سیے، لباں ہون دراز تاں ساڑیئے اوئے
جیہڑا فقہ دے علم دا نہیں واقف، اوہنوں چا سولی اتے چاڑھئے اوئے
وارث شاہ خدا دے دشمناں نوں، دوروں کتیاں وانگ درکاریئے اوئے

بلاشبہ اس میں ملاں کا لہجہ درشت ہوگیا ہے اور اتنی بڑی مسجد کے امام کا ایک غیر شرع حرکت کرنے والے کے لئے ایسا لہجہ بے محل نہیں تھا لیکن اس کے جواب میں رانجھے کا یہ کہنا کتنا بر محل تھا، خود اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سانوں دس نماز ہے کاس دی جی، کاس نال بنائے کے ساریا نیں
کن تک نماز دے ہین کتنے، متھے کیہناں دے دھروں ایہ ماریا نیں
لے قد، چوڑی، کس ہان ہوندی، کس چیز دے نال مواریا نیں
وارث کلیای کسیاں ایس دیاں نیں، کس نال ایہ ہتھ اتاریا نیں

یہ سوال و جواب بھی وارث کے تخیل زادے تھے اور اس آئینے میں سے وارث کے شرعی رویئے کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں نہ قصور کی جبکہ نہ پاک پتن کی۔

(د) اب ہم کیدو کی طرف آتے ہیں۔ اس کا ذکر دمودر نے یوں کیا ہے کہ جب ہیر اور رانجھے کے پیار کی باتیں فتنہ برلب ہوتے ہوئے ہیر کی ماں کے ذریعے چوچک تک پہنچیں تو۔

ہوئے دیوانہ چوچک خانا، کیدو سوالایا
تھیو نہ ناری میرے ولوں میرے ماں پیو جایا

گھر گھر وتنائیں سیل کر یندا تین بھی سن کجھ پایا

اور جب کیدو تصدیق کرتا ہے کہ اس نے جو کچھ سنا ہے سچ ہے تو چوچک کہتا ہے

کہ

سن بھائی میں صدقے کیتا' تینوں آکھ سنائیں
بیلے جائے حقیقت کھلے' آ آکھیں میں تائیں
لیکن ویدنی اے بیلے دے وچ اساں سالم کچھ تاہیں
ناؤں سائیں دے' تھیونہ ناریٔ وقت پیاس تائیں

کیدو کہتا ہے کہ یہ کام میرے بس سے باہر ہے کہ

اوہ ٹلے نہ اکبر نالوں' میوں جان مریندا
جے ویکھے تاں چھڑے ناہیں آپ کیوں ناہیں ویندا

چوچک اس کی منت کرتا ہے اور وہ اس پر گویا ترس کھا کر حامی بھرلیتا ہے اور پھر جس طرح مشہور ہے رانجھے سے "چوری" لے کر چوچک کے پاس آجاتا ہے جو وہی چوری اپنی بیوی مہری کے پاس لے آتا ہے لیکن ماں پردہ پوشی کرتی ہے کہ "منت کڑیاں خضر دی آہی" اور یہ چوری میں نے ہی کوٹی تھی۔ اس میں سے انہوں نے کیدو کو بھی گدا دے دیا ہوگا۔ چوچک کو یہ بات نہ جچی اور وہ متفکر سا دائرے میں آن کر لیٹ گیا۔۔۔ پاٹا پیٹ کی پٹی بجھے' سنیا عالم سارے۔ ادھر ہیر نے رانجھے سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک مانگت آیا تو تھا۔ غصے میں ہیر نے کیدو کی کرتوت دیکھ کر اس کی جھونپڑی کو نذر آتش کردیا۔ یہاں دمودر کہتا ہے کہ کیدو نے ہیر کے پاس ہی آن کر گلہ کیا کہ ۔۔ میں کیہ کیتا ہیرے دھیئے' تیں جھگی میری جالی اور وہ جواباً" کہتی ہے۔

اج میں کیہ کیتا تایا' تینوں اے ہور کریساں

داڑھی تیری دے وال نہ چھوڑاں ہک ہک میں پیساں
جیرھی جنگھ چنگیری تیری، منڈی ؟؟ توڑیساں

اور یوں پہلی بار دمودر ہی کیدو کے لنگا ہونے کی بات کرتا ہے اور وہ بھی خانہ سوزی پر ہیر اور تائے کیدو کی باہم گفتگو کرواتا ہے جس میں کیدو کا لہجہ اور رویہ معذرت خواہی کا ہے اور وہ اعتراف کرتا ہے کہ تو اگر دشمن بن جائے تو یہاں میرا رہنا ممکن نہیں رہے گا لیکن ہیر کا انداز جارحانہ ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد دمودر کیدو کا دوبارہ ذکر اس وقت کرتا ہے جب کھیڑے برات لے کر آئے ہوتے ہیں اور ہیر ڈولی میں بیٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ ایسے میں کیدو کو بلایا جاتا ہے اور وہ راہ نکالتا ہے کہ دھیدو کو بھی سامان جہیز اٹھوا کر ساتھ بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد پوری داستان میں اس کا ذکر نہیں آتا۔

کیدو کے متعلق مقبل یوں سخن طراز ہوتا ہے کہ ہیر اور رانجھے کی کہانی جب آوارہ ہر گوش ہوگئی تو ماں چوکنی ہوگئی لیکن:

ورجی ماؤں وہی ہیر نہ رہی مولے، ویلا چا لکے یار دے جاوندی سی
گھروں لگنوں ہیر دا داؤ رہیا، کیدو لنگیں دے دا ترے آوندی سی
دھوئیں وچ لکا کے روٹ خاصہ، کٹ گھیوتے کھنڈر لاوندی سی
بھر پور کے چوری دے نال چھنا، پیارے مقبلے لئی لیاوندی سی
کیدو ویکھدا تنگ آیا، نڈھی ہیر دی ویکھ کے سب چالی
فکر ہیر تے رانجھے دے پکڑنے دا کیتا اوس بد بخت نے مہر خالی

چنانچہ بقول مقبل ایک رات ہیر کو چوری کا چھنا لے کر رانجھے کے پاس جاتے ہوئے کیدو نے دیکھ لیا اور پھر وہی ہوا جس طرح وارث نے لکھا ہے۔ ہاں وہ بھی دمودر کی طرح لکھتا ہے کہ کیدو نے خانہ سوزی کا گلہ ہیرے سے جا کر کیا اور اس نے جواباً" کہا کہ "اک لا لکے کسے نہ انب چوپے" اور جب وہ چوچک کے پاس جاتا

ہے تو وہ اسے یوں تسلی دیتا ہے۔

چوچک آکھدا کیدو نوں جیو شالا' تیری جھگی نوں خیر بناؤساں میں
کھان پین دی خیر دو وقت لیساں' بدن کپڑے تساں دلوا وساں میں
تیرا گیاتے گل اسباب دیساں' دونا ہور وی کچھ پہنچاوساں میں
بند ہیر یوں لیاکے کسے ویلے' تیری مقبلا صلح کراوساں میں

اور اس کے بعد قصے میں اس کا کوئی ذکر نہیں آتا اور یوں دونوں نے اسے داستان کے کسی نمایاں کردار کا درجہ نہیں دیا اور اس کے لیے یک پا کے علاوہ کوئی منفی یا مثبت لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ اس کے برعکس وارث نے جس طرح آغاز ہی میں لڈن کو وڈھی کپن کے خطاب سے نوازا اور ملاں کو "پنڈ جھگڑیاں دی" گردانا اسی طرح اس نے کیدو کو بھی معاف نہیں کیا اور اس کے داستان میں اولین واسطے کا انداز یہ ہے --- "وارث شاہ میاں ویکھوں ٹنگ لنگی شیطان دی کلا جگا وندی اے" اور یہ کلا کیا ہے کہ وہ ایک ایسے معاشقہ کو اپنے منطقی انجام تک پہنچنے نہیں دینا چاہتا جسے معاشرہ مناسب خیال نہیں کرتا۔

یہاں ایک بنیادی نکتے کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ کسی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کا تانا پیٹا دو ہی باتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے اس کو کیا سمجھتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اس کا اپنا وطیرہ کیا ظاہر کرتا ہے۔ یوں وارث شاہ کا مذکورہ بالا مصرع بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے کہ کسی کلا جگانے سے پہلے ہی اس کو مہتم کردیا گیا ہے اور پھر جب وہ رانجھے سے ہیر کی غیر حاضری میں چوری مانگ کرلے جاتا ہے اور ہیر کو پتہ چل جاتا ہے تو وہ اس کا پیچھا کرکے اسے جاگھیرتی ہے اور ۔ پکڑ زمیں تے ماریا نال غصے' دھوبی پٹڑے تے کھیس چھٹیتا ہو اور یہاں بھی وارث ہیر کا ہی دھڑا کرتا نظر آتا ہے جب کہتا ہے -- وارث شاہ فرشتیاں عرش اتوں شیطان نوں عرش تو سٹیا ہو اور اسی پر بس نہیں ہوتی۔ جب کیدو ملکی کو ان کو

کہتا ہے کہ تیری دھی وڈا چج چاپائی تو وارث اپنی تان اسی پر توڑتا ہے کہ "وارث شاہ میاں ستے معاملے نوں گنلے رچھ نے فیر جگایا ای" بلکہ آگے چل کر بھی یہ جتاتے ہوئے کہ لنگڑوں کی ایک رگ زیادہ ہوتی ہے وہ کہتا ہے -- وارث شاہ ابلیس دی شکل کیدو ایہوا مول ہے کل بکھیڑیاں دا۔ دوسری جانب ہیر کی کیدو کی متعلق یہ رائے ہے (جو دار اصل وارث ہی کی رائے ہے) کہ --- "ملے دلاں نوں ایہہ نکھیڑ دیندا" بھنگ گھتدا وچ کڑمائیاں دے"۔ اسی طرح چوچک اس کو جھوٹی باتیں اڑانے بتانے والا کہتا ہے اور زمانے بھر کا چغل خور گردانتا ہے۔ جسے جھگڑے فساد کھڑے کرنے کا ڈھنگ آتا ہے اور تو اور ہیر کی سہیلیوں نے اس بچارے کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر بھی وارث کہتا ہے "چور ماری دا و یکھین چلو سادھو وارث شاہ ایہہ ضبط سرکار دی اے" بلکہ مزید اور چوچک ان کو کچھ کہنے کی جگہ کیدو ہی کی سرزنش کرتا ہے اور پنچ بھی بس پسپا کرتے اور کہتے ہیں --- پنچاں کیدو نوں آکھیا صبر کر توں تیوں ماریا نیں جھک ماریا نیں۔

یعنی پوری داستان میں اور پورے جنگ میں ایک فرد بھی اس کی حمایت میں آواز نہیں اٹھاتا اس سے دو ہی باتیں عیاں ہوتی ہیں کہ یا تو وہ لوگ ہی مصلحت شناس تھے یا کیدو تھا ہی برا اور ابلیس صورت، کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ہم داستان میں جھانکتے ہیں۔ اس سے ہمارا پہلا واسطہ چوری کے سلسلے میں پڑتا ہے۔ وہ چوری لا کر اہل مجلس کو (جو اہل دیہہ بھی تھے) دکھاتا ہے اور ان پر ایک ایسے شخص کا باطن واضح کر رہا ہے جو چوچک کے گھر میں ایک چرواہے کی حیثیت سے رہتا تھا اور ہیر اس کے مالک کی بیٹی تھی اور کیدو کا اس میں کوئی ذاتی نفع یا نقصان نہیں تھا لیکن دیہاتی اجتماعی معاشرہ میں ایسی بات کی حمایت کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا ہاں دوسرے مصلحت کوش تھے اور کیدو بے باک بلکہ چوچک کا صحیح معنوں میں خیرخواہ اور جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا وہی ہو کر رہا۔

چاک نال اکلڑی جائے بیلے' اج کل کوئی بھک لاوندی آ

اور اس کا قول اور فعل کسی جگہ بھی شیطانی کلا جگانے والا نظر نہیں آتا۔ وہ loose talked بھی نہیں۔ اس نے چوچک سے بات کی یا ملکی سے بات کی اور سمجھانے کے انداز میں یہ کہتے ہوتے کہ اس کو کہیں بیاہ دو اور یہ وہ بات ہے جو باہمی رابطوں والے دیہاتی معاشرے میں ہر خیر خواہ کے لبوں کا حق ہوتی تھی۔ اسی طرح جب وہ ہیر کو دریا پر رانجھے کے ساتھ شناوری کرتے اور بے تکلف ہوتے دیکھتا ہے تو ملکی کو خبردار کرتا ہے۔ جو پال میں جا کر کسی سے نہیں کہتا کہ "طوطا انب دی ڈال تے کرے موجاں"۔ اس سے اس آم کو وہ سیالوں ہی کا آم جانتا ہے۔ ان سیالوں کا جن کا وہ ایک فرد ہے اور طوطے سے اسے بچانا اس کا اخلاقی فرض تھا اور ہم کسی حوالے سے (کسی قصوری یا پاک پتنی قدر کے حوالے سے) وارث شاہ سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ "وارث شاہ میاں سنے معاملے نوں لگنے رچھ نے فیر جگایائی۔" کیوں کہ یہ تو کسی نقب کی زد میں آئے ہوتے گھر والوں کو بیدار کرنا تھا۔ چوچک اور ملکی خواب غفلت میں تھے اس پر کیدو ایک بار پھر کوشش کرتا ہے۔

۔ کیدو آکھیا جیو تدبیر کرکے' ایہ جوہ چو جان کے کھیڈ دے نی
میرے آکھیاں دھیاں نوں نہ مارن' پنڈ کون مارن خون ۔ بھیڈ دے نی

چنانچہ وہ چوچک کو موقع پر لے جانا چاہتا ہے اور وارث شاہ اس کی کوشش کی یوں داد دیتا ہے کہ --- "وارث شاہ پرائیاں جھگیاں نوں' اگ لا گنلے ہوری سیکدے نی۔"

یہیں سے یہ شک ابھرتا ہے کہ کیدو کے خلاف حد سے بڑھا ہوا اور بے محل غم و غصہ وارث کے اندر اس لیے ابھرا کہ وہ کسی بھاگ بھری کے سلسلے میں خود بھی کسی کیدو کا زخمی تھا۔ جو جنڈیالے یا قصور میں اس کا سگ راہ بن گیا تھا کہ نفسیاتی طور پر ہم اپنی بعض نفرتوں اور خصوصیتوں کو بعض دوسرے متعلقین کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ رقیب کا لفظ ابھی کل تک ہماری اردو شاعری کی ایک اہم

علامت تھا۔ یہی صورت آسمان کی تھی کہ ہم خدا کے خلاف لب کشا نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ہر ناگوار شدنی و ناشدنی کو گردش ملک ار ستم آسمان کہہ دیتے تھے اور خار برق، فضا، دام، آسمان، صیاد وغیرہ کتنے ہی ارباب ستم کے نام تھے اور اب معاشرے کی تبدیلیوں کے باعث نہ ہمارے اشعار میں رقیب کی گنجائش رہی ہے نہ زندگی میں اور اس صدی کے نصف اول میں ظالم سماج "کا جس قدر گلہ شکوہ ملتا تھا اب وہ نہیں ملتا۔" آج کا کوئی رانجھا کسی کیدو کا شاکی نہیں ملتا کہ اب ہیر اور رانجھے کو کسی بیلے یا کسی نائن کی محتاجی نہیں رہی اور نہ کسی نوجوان شاعر سے اس کے یار کوئی داستان معلوم کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

قصہ مختصر کہ ہیر کے آئینے میں وارث نہ تو باوا فرید کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے نہ شاہ حسین، بلھے شاہ اور خواجہ فرید کی صف میں جنہوں نے اگر عشق کو جگ کا مول جانا تو زندگی بھر اس بات پر پہرہ دیا اور اس کے لئے لوک داستانوں کے کرداروں کو علامتی طور پر برتنے کے باوجود ہیر اور چوچک کی داستان طرازی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اپنے متقدین اور متاخرین داستان طرازوں کے قبیلے میں بھی وہ غبی تشنہ کامی کے حوالے سے مختلف نظر آتا ہے اور ہیر کے ساتھ سیف الملوک کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ دونوں مصنفوں کے مزاج میں کیا فرق ہے اور کتنا فرق ہے اور کیوں۔ حقیقت یہ ہے کہ گنتی کہ چند اشعار کے سوا پوری داستان ہیر میں گداز والے اور گداز سخن اشعار نہیں ملتے جو آپ کو آبدیدہ کردیں۔ جب کہ سیف الملوک اور احسن القصص (مولوی غلام رسول) میں آپ کو ایسے اشعار کی فراوانی ملے گی اور میں نے آج سے نصف صدی پہلے لوگوں کو وہ اشعار پڑھ پڑھ کر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہیر اور رانجھے کی داستان میں ہجر اور فراق کے وہ لمحے آئے ہی نہیں یا لائے ہی نہیں گئے جو دونوں میں سے کسی ایک کے اندر گداز پیدا کرتے اور اس کا تعلق وارث کے اپنے مزاج سے تھا جو میاں محمد بخش اور مولوی غلام رسول سے مختلف تھا۔

وارث کے اس اسلوب کے جواز میں البتہ ایک بات کہی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ ہرچند اس دور میں وہ محفلیں اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی تھیں جن کے ذکر رنگین سے بوڑھی عمر میں بھی ضیا الدین برنی (مصنف تاریخ فیروز شاہی) کے دہان تصور سے رالیں ٹپکنے لگتی تھیں لیکن ہر دور اور ہر زبان کے شاعر کے اندر ایک خواہش ایک روایت بن چکی تھی کہ کوئی اس کی سرپرستی کرے اور اس کے شعر سنے اور ان ارباب سیف سرپرستوں کی محفلیں اپنی اپنی بساط کے مطابق شعر و شراب سے رنگین ہوا کرتی تھیں چنانچہ دربار دہلی کی رنگیلی راتیں لوگوں کو یاد تھیں اور وارث کے بعد رنجیتی دور میں بھی ان کی جھلک نظر آتی ہے اور فقیر وحیدالدین نے اپنی تصنیف The Rial Rain میں ایک باب اس کے لئے وقف کیا ہے وارث کی تصنیف کو اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو قرین قیاس ہے کہ اس نے بہت سی باتیں اپنے سامعین کی خوشنودی طبع کی خاطر لکھی ہوں یا ایسے مناظر کو طول دیا ہو۔ کیوں کہ وہ قصور میں رہا ہو یا دیپالپور میں یا ملکہ ہانس میں وہ ایک شاعری کے حوالہ سے متعارف ہوا ہو گا اور جب کبھی معمول کی ان ایام کی پکڑ دھکڑ گردوار سے لوگ فارغ ہوتے ہوں گے تو چھوٹے سے پیمانے پر ایسی محفل بھی کبھی نہ کبھی سج جاتی ہوتی ہوگی جس میں کلام شاعر بہ زبان شاعر سنا جاتا ہو گا اور خود وارث نے ان الفاظ میں جس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ ۔"یاراں نال مجالساں وچ بہہ کے مزہ ہیرے دے عشق دا پایئے جی"۔

ایک بات جس کا کریڈٹ بہر حال اس دور کے حوالے سے وارث کو دینا پڑتا ہے اور جس سے اس کا مزاج ہی منعکس ہوتا ہے یہ ہے کہ پوری کتاب میں شراب کا ذکر نہیں آیا حالانکہ شادی بیاہ کی تقریبوں کے ذکر میں ہی نہیں ان کے انعقاد میں یہ چیز رومانی عام رہی ہے اور یہ بھی نہیں کہ سیالوں اور کھیڑوں کے رویوں میں کوئی ایسی مذہبی یا روحانی فضا بپا کی گئی تھی جس کے باعث دختر زر کا وہاں داخلہ ممنوع تھا اور وارث نے اپنے دور کی اپنے سے قدرے پہلے کی یا دور

پہلی جو بھی فارسی مثنوی پڑھی ہوگی اس میں اس کا ذکر اس نے ضرور پڑھا ہوگا۔ اس کے باوجود اس داستان شوق کو اس کے ذکر سے آلودہ یا رنگین نہ کرنا کہتا ہے کہ وہ ذاتی زندگی میں اس سے دور اور نفور رہا ہوگا۔

یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسنے والی ملکہ ہانس کی سرپرستی خریدنے کی کوئی کوشش کی نہ والی دیپالپور کی نہ کسی خان قصور کی کیوں کہ اس قسم کا کوئی اشارہ اس کے کلام میں نہیں ملتا اور یوں وہ معروف معنوں "اوراسی" طبقے سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود جس کی طرف اس نے اشارہ کیا ہے کہ اس سے "اداسی" اختیار کرلی ہے اور اب سید وارث سے وارث شاہ ہوگیا ہے عملاً وہ ان دنیوی حاجات سے دور رہنے والے لوگوں میں ہوگا اور قناعت پسند۔ اسے اس کا تو افسوس ہے اور شکوہ آمیز افسوس کہ اشراف ملول کمین تازہ لیکن یہ معاشرتی تبدیلی کے حوالہ سے ہے ورنہ اس نے بڑی وضع داری سے اپنے معاشی دکھوں کو چھپایا دبایا اور سارے کلام میں نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ۔

بھاگ بھری اور وارث شاہ

بھاگ بھری کی ترکیب وارث شاہ نے ایک سے زیادہ بار قصے میں برتی ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ کسی جگہ بھی اس سے کوئی مخصوص نسوانی شخصیت مراد نہیں لی جاسکتی اور ہر جگہ اس سے یہ ہی مفہوم لیا جاسکتا ہے کہ اسے بھاگوں والی یا اسے وہ جسے خدا بھاگوں والی کرے لیکن یار لوگوں نے یا تو خود وارث شاہ کے زمانہ سے چلتی آ رہی کسی سماعی روایت کی بنیاد پر یا بھاگ بھری کی ذو معنویت سے خود یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وارث شاہ کی کوئی محبوبہ تھی اور اس کا نام بھاگ بھری تھا۔ یہ صورت ہر دور میں اور ہر زبان میں بعض شعرا کو درپیش آتی رہی ہے۔ "شاخ نبات" اور حافظ کو ایک دوسرے سے وابستہ کیا گیا۔ مولوی غلام رسول عالم پوری کا کسی طالع سے تعلق کھوج نکالا اور یہ تو راقم کے اپنے ابتدائی ایام کی بات ہے کہ علامہ اقبال کے اپنی ایک ہم نام کے ساتھ (جس کا ذکر روزگار فقیر میں بھی ہے) تعلق خاطر کے چرچے تھے اور اس شعر کو (جواب بانگ درا کا حصہ نہیں ہے) اسی اقبال سے منسوب کیا جاتا تھا۔

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

بلکہ علامہ صاحب کے بعض ہم عمر بزرگوں کا کہنا تھا کہ ذیل کے اس شعر میں بھی علامہ صاحب نے جو ان دنوں علامہ نہیں تھے محض اقبال تھے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے

مدت سے تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اس سے انکار ممکن نہیں کہ مردوں عورتوں میں ایک دوسرے کے لئے

قدرت نے ایک کشش رکھی ہوئی ہے۔ اس کشش کا اظہار بعض اوقات اس قدر برہنہ ہو جاتا ہے کہ دوسرے پا جاتے ہیں جبکہ بعض اتنے محتاط رہنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بات عین الیقین کا درجہ نہیں لے جاتی۔ یا پھر اختر شیرانی کی طرح کبھی سلمٰی سے دل لگا کر بدنام ہو گیا ہوں بستیوں کی لڑکیوں میں کہتے ہیں تو کبھی "یہی وادی ہے وہ ہم دم جہاں ریحانہ رہتی تھی" کہہ کر کسی ایک سے وابستگی کی نفی کر جاتے ہیں۔

وارث شاہ کے بارے میں پریم کہانی کے مصنف کا کہنا ہے کہ "کوی جی آپ بھاگ بھری کے کشتہ عشق تھے اور اسی لئے انہوں نے قصے کو چسکے دار بنا لیا۔ ورنہ وہ بھی مقبل کی طرح بے رس سے شعر لکھتے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ آپ کے پیر پاک پتن شریف میں تھے اور وہ ادھر جاتے تھے کہ ایک بار ٹھٹھہ زاہد کی ایک جٹی کے دام محبت میں گرفتار ہو گئے اور پاک پٹن سے کیا لوٹے کہ پھر اسی گاؤں کے ہو گئے۔ وہی گاؤں ان کا کعبہ ہو گیا اور بھاگ بھری کے باندھے ہوئے وہیں رہ پڑے۔ وہ بھی ان پر فریفتہ ہو گئی۔ ایک چھوٹی سی مسجد میں رہنے لگے۔ سید تو تھے ہی شکل کے بھی جاذب تھے مومنوں کی سی وضع قطع تھی۔ گاؤں میں بات نشر ہو گئی۔ بھاگ بھری کے متعلقین نے شاہ صاحب کو خوب مارا کوٹا۔ پر پھر بھی دل والے شاہ جی نے سب کچھ برداشت کیا اور جب بھاگ بھری کو دھونس سے الگ کیا تو شاہ جی کو بھی گاؤں سے نکال دیا۔ یہ وہاں سے چل دیئے لیکن آتش ہجر زور دکھا رہی تھی اور اسی تپش میں جلتے ہوئے ہیر منظوم کی۔ (میرے والے نسخے میں مرقوم ہے کہ شاہ جی نے ۱۱۸۱ھ میں ہیر لکھی تھی) اس وقت آپ کی عمر تیس پینتیس سال کی ہو گی کہ یہ کلام بڑھاپے کا نہیں لگتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ عشق مجازی کی ٹھوکر کھا کر شاہ جی اپنے استاد مولوی حافظ غلام مرتضٰی کے پاس گئے ہوں اور ان کو جا کر ہیر کا قصہ سنایا ہو اور بعد میں اختتامی اشعار شامل کیے ہوں۔"

دوسری طرف ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کا کہنا ہے کہ وارث شاہ نے نہ صرف یہ کہ کسی بھاگ بھری سے عشق کیا بلکہ شادی تک نہیں کی۔ دیوانہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ پوٹھوار میں ہر اس عورت کو جس کا نام معلوم نہ ہو یا جس کا نام لینا مناسب نہ ہو اس نام سے مخاطب کرتے ہیں بلکہ اپنی بیوی کو بھی اکثر بھاگ بھری کہتے ہیں اور اسے کسی بھاگ بھری کے عشق میں ملوث کرنا اس سے زیادتی کرنا ہے اور شاعرانہ انداز بیاں سے بے خبری کی دلیل ہے۔ملکہ ہانس کے بعض لوگوں نے ہمارے ملاقاتی اور تحقیقاتی دورے کے دوران یہ بھی کہا کہ (بقول ان کے اجداد کے) بھاگ بھری ملکہ کی ہی رہنے والی تھی۔

یہی دو رویے ابھی تک چلتے آئے ہیں اور شاید چلتے جائیں۔ دیوانہ صاحب نے جہاں یہ بتایا ہے کہ بھاگ بھری ایک عام ترکیب خطاب ہے وہاں اس سے ان کا یہ نتیجہ نکالنا البتہ ضروری نہیں کہ سب کے لئے قابل قبول ہو کہ انہوں نے کس بھاگ بھری سے عشق ہی نہیں کیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر انہوں نے کسی سے بر ملا یا دردل محبت کی بھی تھی تو ضروری نہیں کہ اس کا نام بھاگ بھری ہو اور یہ بھی ایک قیاسی بات ہے کہ اس کا تعلق ٹھٹھہ زاہد سے تھا۔ اسی طرح یہ بھی ایک چٹخارہ لینے والی بات ہے کہ افشائے عشق کے تلخ نتائج آپ کو دیکھنے اور بھگتنے پڑے ،کہ ان باتوں کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے۔ ٹھٹھہ زاہد ( ) ملکہ ہانس ہی کی ایک ٹھٹھی تھی جو اب بے چراغ ہی نہیں بے نشان ہو چکی ہے اور وہ پاک پتن سے قصور یا قصور سے پاک پتن جاتے ہوئے راہ میں نہیں پڑتی تھی کہ شاہ صاحب کو اس ٹھٹھی کی مسجد نے اپنی طرف متوجہ کیا ہو کہ افراتفری کے ان ایام میں ملکہ ہانس زیادہ محفوظ جگہ ہو سکتی تھی۔ رہا شاہ صاحب کے وہاں کسی مسجد میں ڈیرا لگانے کا معاملہ تو یہ بھی قیاس آرائی ہے اور جیسا کہ پہلے بھی ایک جگہ اشارہ کیا جا چکا ہے مساجد بے امام نہیں ہوا کرتیں کہ ہر راہرو اس پر مالکانہ قبضہ جما بیٹھے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شاہ صاحب کسی مسجد یا اس کے حجرے ہی کو اپنی اقامت سے

نوازتے۔ ذہن کہتا ہے کہ معتقدین نے ہیر کی داستان میں رانجھے کے مسجد میں شب باش ہونے سے قیاس آرائی کی (اور کرنے والے ابتدا میں غیر مسلم ہی تھے) کہ شاہ صاحب نے مسجد میں ہی رخت اقامت ڈال دیا ہو گا۔

پریم کہانی کے مصنف نے ۱۹۳۱ میں وفات پائی۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ یادگار وارث نے ہرچند باوابدھ سنگھ کی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا جس میں صرف ہنس چوگ کا ذکر کیا ہے لیکن مصنف نے پریم کہانی کا ضرور مطالعہ کیا ہو گا کیوں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کتاب کی درج بالا سطور سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے پنجابی ادبی اکیڈمی کی جانب سے شائع کردہ ہیر کے نسخہ عزیزیہ میں لکھا ہے کہ وارث شاہ نے بھاگ بھری کا لفظ اپنی محبوبہ کے لئے استعمال کیا ہے اور اس کی یہی محبوبہ تصنیف ہیر رانجھا کی اصل محرک ہے۔

لیکن یہ بات جو ''معشوقہ پنجاب'' کے مصنف چوہدری افضل حق کے تاثرات کے بغیر شاید نامکمل رہے۔ چوہدری صاحب لکھتے ہیں کہ ''محرم راز عشق سے پوشیدہ نہیں کہ ناکام عاشق کامیابی کے لئے کیاکیا حیلے سوچا کرتا ہے۔ راتیں اسی بچار میں کٹ جاتی ہیں کہ میرا ذکر ان کی محفل میں کیوں کر پہنچے۔ اسی مدعا کے لئے قصہ ہیر رانجھا بنایا' جو آیا اسے سنایا' کتاب ہیر رانجھا گویا اپنی حالت کا مرقع تھا۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

یہ کتاب دوسرے معنوں میں وارث شاہ کا کھلا سا عاشقانہ خط تھا جو بھاگ بھری کو لکھا گیا۔

یوں ہم مذکورہ بالا حضرات کے اپنے اپنے تاثرات و استنباطات سے اتفاق کریں یا اختلاف اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا جو مصنف نے خود کہا ہے کہ ''تدوں شوق ہویا قصہ دا جدوں عشق دی گل اظہار ہوئی۔'' البتہ یہاں راقم اظہار

(شرح احوال سید وارث شاہ)۔

کے معنوی مضمرات کی طرف بایں معنی متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ اس سے ظاہر ہونا ضروری نہیں کہ مراد لیا جائے اور مراد مصنف بھی ہو۔ اس کا یہ مفہوم بھی تو ہو سکتا ہے کہ جب (دوسری جانب سے) اظہار عشق ہوا تو داستان طرازی کا شوق پیدا ہوا تاکہ جس طرح "معشوقہ پنجاب" کے مصنف نے اشارہ کیا ہے ان اشعار کو چوپال میں بیٹھ کر گایا جائے اور اس کے کانوں تک بھی جا پہنچے جس تک پہنچانا اب اظہار محبت کے بعد ضروری ہو گیا تھا۔ یہاں ذیل کے یہ اشعار شاید میری بات کو زیادہ واضح کر سکیں۔ ۔

مجھے تم سے محبت ہے بہت سادہ سا جملہ تھا
یہ وہ الفاظ تھے جو ہر کس و ناکس کے لب پر تھے
میں حسن و عشق کے قصوں میں اکثر ان کو سنتا تھا
نہ مجھ پر تھا اثر ان کا نہ یہ اتنے مؤثر تھے
مگر تم نے حجاب آگیں ادا سے سرنگوں ہو کر
لب لعلیں کو جنبش دی اور اس فقرے کو دہرایا
تمہاری سادگی تھی اور یہ پیغام جاں پرور
مرے دل نے سنا اور سن کے مجھ پر یہ ستم ڈھایا
رگ و پے میں مرے ظالم نے لاکھوں بجلیاں بھر دیں
سکون و ضبط کی سب کوششیں یوں رائیگاں کر دیں

یعنی ایک غیر متوقع جانب سے غیر متوقع اقدام ربانی میرے خیال میں تحریک داستان کا باعث بن گیا۔ اب اس شخصیت کو آپ جو نام بھی دینا چاہیں دے لیں کہ پھول کسی نام سے بھی پکارا جائے اس کی خوشبو میں فرق نہیں پڑتا۔ ہیر وارث شاہ کی مقبولیت کا ایک باعث یہی ہے کہ جس طرح میں نے (آج سے تقریباً چالیس سال پہلے) لکھا تھا کہ ہیر وارث کے بعض بول ایسے ہیں جو ہم میں سے

بہتوں کی آپ بیتی ہیں یا آنکھوں کے آگے ہوئی گزری کی "ایف آئی آر" ہیں۔ ہم نے کانوں میں مندریں اور گلے میں نیکلس نہ پہنی ہوں تو بھی عمر کے کسی نہ کسی حصے میں لعل ضرور گنوایا ہوتا ہے اور بہتوں نے حویلیوں ہی میں گنوایا ہوتا ہے۔ یوں کہئے کہ کھیڑے ہاتھ پر ہاتھ مار کر لے گئے ہوتے ہیں اور یوں ہیر رانجھے کا درد ہمارا اپنا درد بن جاتا ہے۔ ادھر رہن سہن کا انداز کچھ ایسا چلا آرہا ہے کہ ہم میں سے بہتوں کی زندگیاں تار تار پیرہن بن کر رہ گئی ہوتی ہیں اور جو رفو سے کام لیتے ہیں کامیاب ہو گئے ہوتے ہیں یا حالات سے سمجھوتہ کر جاتے ہیں وہ بھی جب سنتے ہیں کہ "ہیر آکھدی جو گیا جھوٹھ بولیں کون رٹھڑے یا مناوندااِی" یا "بھلا موئے تے وچھڑے کون ملے تواس وقت ان کو اپنے پیرہن کے تار اور الٹی سیدھی رفوگری کے انداز یاد آجاتے ہیں اور رانجھا ہم میں سے بہتوں کی سدھروں کا روپ لے جاتا ہے۔ ہم جو کچھ کرنا چاہتے تھے اور نہیں کر سکے ہوتے وہ کر کے دکھا دیتا ہے۔ اسی لئے ہمیں اس کے چھدے ہوئے کانوں سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ شادی بیاہ کو قاضیوں اور ماں باپ نے (ابھی کل تک) جن پسندوں میں سپنایا ہوا تھا ان میں پھڑکتے ہوئے کون سا قصہ ہیر رانجھے کے قصے سے زیادہ دلوں کی نمائندگی کر سکتا ہے اور جب ہم "بھاگ بھری" سے وارث شاہ کو وابستہ کرتے ہیں تو دراصل اپنے آپ کو وارث شاہ بنا ٹھہرا کر اپنی اپنی بھاگ بھریوں کو یاد کرتے ہیں اور اپنے اندر کی مخالف اٹھتی ہوئی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وارث شاہ ایسا بزرگ انسان بھی اس آگ سے نہ بچ سکا تو گویا ہم کیسے بچ سکتے تھے۔ وارث شاہ نے بھی مرے خیال میں آغاز کلام میں اپنی اسی داخلی کیفیت اور کشمکش کو جان لیا ہے جب کہا ہے کہ "عشق کیتا تو جگ دا مول میاں" کہ یہ داستان کسی پہلو سے بھی ان معنوں میں روح اور کلبوت کی بات نہیں بنتی جن معنوں میں اختتامی (معذرتی) اشعار میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جن کو میں الحاقی اشعار سمجھتا ہوں۔ یہ ان معنوں میں البتہ ضرور روح اور کلبوت کا قصہ بن جاتا ہے

اگر ہم ہیر اور رانجھا میں سے یا وارث اور کسی بھاگ بھری میں سے ایک کو روح اور دوسرے کو کلبوت کہ لیں جیسا کہ میرے خیال میں وارث نے خود بھی "کئی بول گئے شاخ عمردی تے آہلنا کسے نہ پایا ای" والے بند میں کہا ہے --- ایک روح کلبوت داد کر سارا نال عقل دے میل ملایا ای" کیوں کہ ہر زبان کی شاعری میں محبوب کو روح اور جان ٹھہرایا گیا ہے۔

خاتمہ کتاب کا یہ بول بھی قابل توجہ ہے کہ ---- ختم رب دے کرم دے نال ہوئی فرمائش پیارڑے یار دی سی" اور اسی بند میں سے بھی کہا ہے---- "تمثیل دے نال بیان کیتا" جس سے یہی ترجیح ہوتا ہے کہ ہیر رانجھا کی داستان کو وارث شاہ نے پیارے یار کی فرمائش جان کر لکھا ہے آخر میں اپنی کیفیت کو بھی بے نقاب کر دیا ہے کہ

وارث شاہ نوں سک دیدار دی سی
جئی ہیر نوں ۔ بھٹکن بار دی سی

یعنی وہ تشنہ ہیر تھا اور تشنہ کام رہا۔ اس کی اپنی ہیر بھی یار کے لئے بھٹکتی ہی رہی۔ یہاں اس احساس کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وارث شاہ نے جس تعمیل ارشاد کا ذکر اختتام داستان میں کیا ہے کہ "فرمائش پیارڑے یار دی سی" اسی کا ذکر آغاز داستان میں بھی ضروری جانا کہ---- "حکم من کے سجناں پیاریاں واقعہ عجب بہار دا جوڑیا اے" اور یوں چوہدری افضل حق صاحب کا یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ یہ داستان وارث شاہ کا اپنی "ہیر" کے نام ایک کھلا خط تھا۔ یہاں "سجناں پیاریاں" کی ترکیب اور "یاراں اساں نوں آن سوال کیتا" سے یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شاعر نے اپنے دوستوں کی خاطر اس داستان کو از سر نو لکھا تھا لیکن پنجابی زبان و بیان کے مزاج شناسوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی کہ زیادہ قلبی تعلق کا اظہار کرتے ہوئے کبھی کبھی واحد کی جگہ جمع سے کام لیا جاتا ہے اور یہاں شاعر نے ایسا ہی کیا ہے۔ نفسیات دانوں کا کہنا ہے کہ جسے ہم سک یا سدھریا تمنا و

تقاضا کہتے ہیں اس کی جڑیں ولادت کے ساتھ ہی ہری ہونے لگتی ہیں اور ماں سے اسے جو گرمی اور سکون اور غذائیت ملتے ہیں ان کے ذریعے اس سے وابستگی کی ایک بے آواز دبے اظہار سی صورت پیدا ہوجاتی ہے اور ایک خاص قسم کے گوشت پوست والے جسم سے گویا اس کا تعلق خاطر پیدا ہوجاتا ہے جس کا متبادل آہستہ آہستہ گھر کے دوسرے افراد بننے لگتے ہیں۔ یہ متبادلات جس آسانی سے بچے کے گھر، گلی اور گاؤں میں میسر آنے لگتے ہیں اسی کے مطابق ماحول کے بارے میں اس کا ایک نظریہ سا بن جاتا ہے کہ وہ سازگار ہے یا ناسازگار اور چونکہ وہ کبھی بھی کسی کے لئے مثالی نہیں ہوتا اس لئے زندگی اکثر اعرافی حالت کی سی ہوتی ہے جس میں دوزخ اور جنت دونوں جانب کے دریچے کھلے ہوتے ہیں لیکن بعض کو آنچ سے زیادہ واسطہ ان کو قنوطی کر جاتا ہے۔ یا پھر دوسرے دریچے کی آرزو زیادہ رہتی ہے اور اس کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور اس کے لئے دعائیں اور دوائیں بھی کی جاتی ہیں۔ نفسیات دانوں نے جس کیفیت کو separation consciously کہا ہے۔ شاعری کی زبان میں اسے دردِ ہجر کہا جاتا ہے جو ناکامی و نامرادی سے شدید ہوتا جاتا ہے اور ہرچند کوئی اصول یا ضابطہ تو نہیں لیکن بعض کے لئے خیالی پلاؤ پکا کر مٹانے یا بہلانے کی راہ سہولت کھل جاتی ہے اور وہ گویا خوابوں کی دنیا میں رہنے لگتا ہے اور آسودگی محسوس کرتا ہے بلکہ بعض کے اندر اسی سے نظریات سازی اور تمنا بافی کا رجحان پیدا ہوجاتا ہے۔ بعض اس صورت حالات سے دوچار ہو کر فنونِ لطیفہ کی کسی ایک شاخ کی جانب دبک جاتے ہیں اور وارث شاہ کا شاعری کی جانب جھکاؤ اشارہ کرتا ہے کہ ماں کی ممتا کا مثبت متبادل اسے نہیں مل سکا ہوگا اس کی تلافی بظاہر ذوقِ شعری نے کردی ہوگی اور اسے کسی بھاگ بھری کے روپ میں عارضی طور پر (کسی خواب کی طرح) وہ سکون ملا ہوگا جو ماں کے محبت بھرے لمس نے اس کے احساس کی تختی پر لکھ دیا تھا اور جس کی تلاش اسے عمر بھر رہی۔

وارث شاہ اور فحش گوئی

یہ عنوان یادگار وارث کے مصنف نے باندھا تھا اور وہاں سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار بر سبیل تذکرہ راقم اوراق ماسبق میں بعض جگہ کرچکا ہے۔ اس لئے یہاں صرف تین وارث شناسوں کے ارشادات پیش کیے جارہے ہیں اور ترتیب وار۔ یعنی چوہدری افضل حق صاحب کے پروفیسر ضیا محمد صاحب کے اور پروفیسر سید علی عباس جلالپوری صاحب کے۔

چوہدری افضل حق صاحب نے "معشوقہ پنجاب" کے عنوان سے اس صدی کی تیسری دہائی میں ایک طویل مضمون یا ایک مختصر سی کتاب لکھی تھی جو ایک عرصہ سے تقریباً ناپید تھی اور جون 1991ء میں بخاری اکیڈمی نے چوہدری صاحب مرحوم کے ساتھ اپنے تعلق قلبی کی بنا پر اس مضمون کو موصوف کی بعض دوسری چیزوں کے ساتھ یک جا کر کے شائع کردیا تھا۔ اس مجموعے کو شعور کا عنوان دیا گیا ہے۔

چوہدری صاحب فرماتے ہیں کہ عاشق کو مشاق زندگی کا کشتی بان جانتے ہیں۔ یہ ایک حد تک سچ ہے بشرطیکہ عاشق غرق جذبات ہونے سے بچا رہے اور طبیعت بے قابو نہ ہونے پائے مگر وہ ناتمام عشق جس کا اظہار ہوجائے دامن شرافت پر داغ ہے اور باوجود اس کے کہ میں مصنف کو شاعر یکتا و عالم بے ہمتا سمجھتا ہوں مگر اظہار عشق میں انہیں معصوم نہیں کہہ سکتا اگرچہ سید صاحب کے بعض ثناخواں انہیں وقت کا ولی اور قصہ ہیر کو قرآن کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ مصنف کی شان میں کچھ کہے بغیر مجھے دوسری بات کے قبول کرنے میں تردد ہے۔ اور ان لوگوں کی تمام ناپاک کوششوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے جنہیں حفظ مراتب کا ذرا احساس نہیں۔ اخلاق فاضلہ کا ماتم کر کے بھاگ بھری کے تاریخی عشق

کو ولایت کا ابتدائی رتبہ مان سکتا ہوں مگر اس تصنیف کو مذہبی عزت و احترام کے قابل سمجھنے کی جرات نہیں کرتا۔ ان مسلمانوں کی بدمذاقی کا ماتم کیوں نہ کیا جائے جو اس پر قرآن پاک کی آیات مزین کر رہے ہیں۔ حالانکہ مجھی اور بنتو کے دو بول اس کتاب کی تفسیر کے لئے زیادہ سے زیادہ موزوں تھے۔ دل چاہتا ہے کہ ناظرین کے تفنن کے لئے کلا باغ سے واپسی پر عورتوں کی ہیر سے چھیڑ چھاڑ کر کے ان لوگوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کروں مگر کیا کروں ذوق سلیم انکار کرتا ہے اور حیا اس کے ذکر سے مانع آتی ہے۔ پنجاب میں ہیر رانجھا کے ذکر کے بعض لوگ یہاں تک قائل ہیں کہ جس محلہ و مکان میں ہفتہ عشرہ یہ عشق پرور قصہ پڑھا جائے وہاں ہیر رانجھا کی روح آتی ہے۔ کسی نہ کسی مرد عورت پر ہاتھ پھیر جاتی ہے۔ تب خبر ہوتی ہے کہ جب محلہ یا بستی میں دو نفوس کی کمی محسوس ہے۔ باوجود اس کے میں ان نامور طالب و مطلوب کو جذبات حیوانی کا شکار تصور کرتا ہوں تاہم اس فیض روحانی کا قائل نہیں جس کی طرف عوام اشارہ کرتے ہیں۔ کیونکہ فاضل مصنف نے جذبات کی ایسی عریاں تصویر کھینچی ہے کہ خواہ مخواہ سننے والے کے سر پر عشق کا سودا سوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جذبات کا یہ مصور شاعر خود جنون خیز عشق سے بے اختیار تھا۔ اس لئے جذبات کی جو تصویر اس نے کھینچی رنگ میں کسی قدر شوخ رہی۔

اس قصہ میں ابتدائے عشق ایسی دلفریب نہیں جیسی کہ انتہائے عشق المناک ہے ابتدا صرف اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ رانجھا ہیر کے باپ کے پاس مویشی چارنے پر نوکر تھا۔ چرواہے کا عشق ہیر کے حسن کو دیکھ کر مچل گیا۔ دیہاتی تمدن آزادانہ میل و ملاپ کا مانع نہ تھا۔ گویا راہ عشق کی پیش قدمی میں کوئی قدم ایسا نہ تھا جہاں رکاوٹ پیدا ہو کچھ عرصہ تو ہیر کے حسن کی سہانی صبح سے شرف

اندوز ہوتا رہا۔ آخر فراق کی دوپہر سر پر پڑی۔ یعنی ہیر کے والدین نے اس تعلق سے خبر پاکر ہیر کا عقد موضع رنگ پور میں کردیا رانجھا کہاں کا پاکباز تھا۔ کہ آداب معاشرت کا پاس لحاظ کرتا۔ بیچارہ معمولی چرواہا تھا۔ اخلاق کو چرنے چھوڑ کر ہیر کے سسرال جا پہنچا ہیر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ساتھ ہولی سسرال نے پیچھا کیا کوٹ قبولے دونوں کو آلیا۔ کوٹا چھینا دو دھکے دیئے ہیر چھڑالی چلو قصہ ختم باقی تفسیریا تو شاعرانہ مبالغہ ہے یا قیاسات میں سے یہ قیاس کچھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہیر کو زہر دیا گیا اور رانجھا اس خبر کے اثر سے جانبر نہ ہوسکا۔ کیونکہ کچھ بات تو ہوئی جس نے ایک قصہ کو مقبول عام بنا دیا۔

حسن و عشق کے اس افسانہ کی صحیح تاریخ و وقوع ملنی مشکل ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سید وارث شاہ سے پہلے اس قصہ نے لوگوں کے تخیل پر کافی اثر کیا ہوا تھا۔ احمد یار خاں صاحب یکتا نے 1142 ہجری اور فقیر اللہ صاحب لاہوری نے 1180ھ میں سید صاحب موصوف نے اس کو مکمل کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تصنیف سے پہلے بھی پنجاب میں اس قصہ کا چرچا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ واقعہ جلال الدین اکبر کے وقت میں ہوا مگر اس کی تائید نہیں کی جاسکتی۔ بعد ازاں تو سینکڑوں پنجابی شعرا نے طبع آزمائیاں کیں لیکن کسی کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی جو سید وارث شاہ صاحب کی تصنیف کو ہوئی۔

سید صاحب نے اس قصہ کی ابتدا کچھ اچھی نہیں کی یعنی رانجھا کو بھائیوں نے بھاوجوں نے طعنہ دیا کہ تب جانیں جب ہیر سیال بیاہ لاؤ۔ یہ طعنہ رانجھا کے دل میں تیر کی طرح ٹھہر گیا اور عشق میں صبر کو کھو بیٹھا۔ یہ ممکن نہیں اس لئے مجھے فاضل مصنف سے اختلاف کرنا پڑا۔ اختتام داستان پر بقول سید صاحب رانجھا نے اپنے وطن میں ہیر کی موت کی خبر سن کر جان دے دی۔

چوہدری صاحب کے تاثرات کے برعکس پروفیسر ضیا محمد صاحب "یادگار وارث" میں وارث کی فحش گوئی کے عنوان سے یوں موصوف کا دفاع کرتے ہیں۔

اشیا کے حسن و قبح، صحیح یا غلط ہونے کے متعلق ارباب فن اور عوام کی رائے میں اختلاف ہونا لازمی اور فطری امر ہے۔ اس کی وجہ عموماً" ایک طبقہ (عوام) کی کم نظری یا ظاہر پرستی اور دوسرے (خواص) کی دوربینی اور حقیقت شناسی ہوتی ہے۔ لہٰذا دونوں کا متفق ہونا قرین قیاس نہیں۔ مثلاً"

۱۔ ایک ماہر مصور ہے۔ وہ ایک ننگے مرد یا عورت کی ہوبہو تصویر بناتا ہے۔ اسی میں ان کے اعضائے مخصوصہ بھی آجاتے ہیں۔ ایک ماہر فن کے نزدیک وہ تصویر اصل کی پوری پوری نقل ہونے کی وجہ سے بہت قابل قدر اور قابل داد چیز ہوگی مگر وہی تصویر ایک عام کی رائے میں فحش اور حیا سوز ہوگی۔ وہ مصور کو داد دینے کی بجائے الٹا اس کو بے حیا بدتہذیب کہہ کر کوسے گا۔

۲۔ ایک طبیب یا ڈاکٹر مصنف جسم انسانی کی تشریح لکھتے وقت اس کے بدن کے ایک ایک عضو کا پورا پورا حال لکھتا ہے۔ اس میں مرد یا عورت کے مخصوص اعضا کا بیان بھی آجاتا ہے۔ یا جس قدر ڈاکٹر مصنف کا بیان اصل کے قریب ہوگا اسی قدر شاہکار اور قابل تحسین ہوگا۔ مگر ایک غیر فنی آدمی اس کو حیا سوز یا فحش قرار دے سکتا ہے اور اس طرح مصنف پر عریانی یا بدتہذیبی کا بے بنیاد الزام تھوپ سکتا ہے۔

شاعر کو مصور یا ڈاکٹر مصنف سے یہ مشکل زیادہ سختی سے پیش آتی ہے کیونکہ اس کے ساتھ مصلح یا رہبر قوم ہونے کی دم بھی عموماً لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ حقیقی شاعر صحیفہ فطرت کا مفسر

یا مصور ہوتا ہے۔ اس صحیفہ کا نہایت اہم جزو انسان ہے۔ جو بحکم (۱) **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم** (انسان کو ہم نے بہترین صورت بخشی اور (۲) **ولقد کرمنا بنی آدم** (یقیناً ہم نے انسان کو مکرم و محترم مخلوق بنایا)۔

اشرف المخلوقات ہے۔ لہٰذا شاعر کو انسانی زندگی (جذبات، عام حالات یا واقعات) کی مصوری لازم ہوگی۔ اب مصور کی طرح شاعر بھی انسانی زندگی کی تصویر جس قدر ہوبہو کھینچے گا۔ اسی قدر اصلیت کے قریب ہوگا۔ بلیغ و موثر ہوگا۔ قابل تحسین ہوگا۔ انسانی زندگی میں جذبات نہایت اہم چیز ہیں اور پھر ان میں سے جذبہ عشق و محبت کو ایک نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی فرد بشر اس جذبہ سے خالی نہیں ہوسکتا۔ خواہ وہ شاہ ہو یا گدا، عالم ہو یا جاہل، زاہد ہو یا رند، مشرقی ہو یا مغربی، حق پرست ہو یا باطل پرست۔

شاعر جب ایک عشقیہ حالت کا سین دکھاتا ہے۔ تو اس کو عشق کی مختلف وارداتوں مثلاً" ناز و نیاز، غمزہ و عشوہ، ہجرووصل، سوزوگداز، بیم و یاس کو بیان کرنا ہوگا۔ بالفرض اگر شاعر کو دو محبوبوں کی ہم کناری اور وصل کا سین دکھانا ہے تو اس وقت اس کو یہ دقت سختی سے پیش آئے گی کیونکہ اگر وہ اس موقع کی پوری پوری تصویر نہیں کھینچتا تو اپنی قادر الکلامی پر دھبہ لگاتا ہے۔اگر عریاں ہوتا ہے تو بے شرم، بدتہذیب اور فحش گو کہلاتا ہے۔ بقول شخصے:۔

دو گونہ عذاب است جان مجنوں را

لہٰذا متانت اور معقولیت کے تقاضا سے بین بین کا راستہ اختیار

کرتا ہے۔ یعنی ہم کناری کی تصویر بھی کھینچ جاتا ہے مگر تشبیہ اور استعارہ کے رنگ میں۔ اس طرح اس موقع کی عریانی بھی سبتا" کم نمایاں ہوتی ہے اور شاعر کا مقصد (واقعہ کا صحیح صحیح فوٹو کھینچا) بھی بہت حد تک پورا ہوجاتا ہے۔

اب اگر ایسے موقعوں (وصل وغیرہ) پر چند حسب حال الفاظ یا اشعار کا لکھنا فحش گوئی ہے تو دنیا کی مہذب سے مہذب اور شستہ سے شستہ زبان بھی اس سے خالی نہ ہوگی اور اسی طرح دنیا کے کسی ثقہ سے ثقہ اور متین سے متین شاعر کا کلام بھی اس سے بچا ہوا نہ ہوگا۔ ہر زبان میں ہر شاعر کم و بیش اشارہ یا کنایہ' تشبیہ یا استعارہ سے ہی اس مقام کو دکھائے گا۔ جو معقولیت اور متانت کا عین تقاضا ہے۔

اس کے شواہد حال پیش کرنے کے لئے خصوصیت سے فارسی زبان کو منتخب کیا گیا ہے کیونکہ وارث کے زمانہ میں (۱) فارسی سب سے زیادہ متداول تھی اور ملک کی علمی' ادبی' دفتری اور درباری زبان سمجھی جاتی تھی۔ شاعر اپنا منظوم کلام اور دوسرے مصنف اپنی کتابیں اکثر اسی زبان میں تصنیف کرتے تھے۔ (۲) عشقیہ' رزمیہ' صوفیانہ اور فلسفیانہ مثنویاں جس قدر فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں لکھی گئی ہوں۔ یہی مثنویاں وارث کے لئے نمونہ تھیں۔

۱۔ مولانا نظامی گنجوی رح

مولانا نظامی اپنے زہد و ورع، علم و فضل، تصوف و حکمت' ثقاہت و متانت

اور شعرو سخن کے لحاظ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ فارسی شاعروں میں آپ سا قادر الکلام اور خدا رسیدہ شاعر شاید ہی کوئی آج تک پیدا ہوا ہو۔ آپ مدحیہ قصائد لکھنے سے سخت متنفر تھے اور درباری تعلقات سے آزاد۔ بڑے بڑے جلیل القدر حکمران مولانا کو مثنویاں لکھنے کے لئے فرمائشی خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے۔ مولانا کو مجبوراً ان درخواستوں کو منظور کرنا پڑتا۔

قزل ارسلان سلجوقی بڑے جاہ و حشم کا شہنشاہ تھا۔ اس نے "خسرو شیریں" لکھنے کے لئے مولانا سے استدعا کی۔ مولانا اس مثنوی کو ختم کرنے کے بعد خود اس کے دربار میں گئے۔ مولانا جب وہاں پہنچے تو قزل ارسلان راگ و رنگ سن رہا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ امرا و وزرا جمع تھے۔ مولانا نظامی کی تشریف آوری کی بادشاہ کو اطلاع ہوئی۔ مولانا کے تقویٰ و طہارت کے لحاظ سے شراب کا دور اور راگ رنگ فی الفور بند کردیا گیا۔ نظامی اندر گئے تو بادشاہ اور امرا تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہوگئے۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی۔

مثنوی "خسرو شیریں" کے پیش کرنے کے لئے باقاعدہ شاہی دربار منعقد ہوا۔ نظامی کتاب لے کر دربار میں آئے قزل ارسلان نے اپنی کمال علم دوستی اور قدر دانی سے مولانا کو اپنے پاس جگہ دی۔ جب قاری (بلند آواز خوش خواں درباری افسر) مثنوی کو پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو مولانا نے درباری آداب کے مطابق ساتھ کھڑا ہونا چاہا تو قزل ارسلان نے سوء ادب سمجھ کے مولانا کو اس پابندی سے آزاد کیا۔

اسی مثنوی "خسرو شیریں" میں خسرو پرویز اور شیریں کی ہمکناری اور وصل کا سین دیکھئے۔ مولانا نے تشبیہ و استعارہ کے رنگ میں اس کو مفصل لکھا ہے۔ اگر اس حصہ کو اصل کتاب سے الگ کرکے کسی ایسے شخص کو دکھایا جائے جو حضرت

طامی سے واقف ہے۔ تو وہ کبھی یقین نہیں کرے گا کہ یہ مولانا ایسے ثقہ بزرگ کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔

۲۔ مصلح الدین سعدیؒ

سعدیؒ کا لقب مصلح الدین (دین کا مصلح یا درست کرنے والا) ہے۔ وہ دنیا کا مشہور و مقبول معلم اخلاق شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے اخلاقیات کسی خاص جماعت یا قوم، کسی خاص خطہ یا ملک کسی خاص مذہب یا ملت سے چنداں متعلق نہیں۔ بلکہ عالم گیر اور جامع حیثیت رکھتے ہیں۔ سعدی کا شمار اکابر صوفی شاعروں میں ہوتا ہے۔

گلستان سعدی اس کا شاہکار ہے اور اپنے اور کلام اور دلکش بیان کے لئے اعجاز کے کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہے فارسی نثر میں باوجود متعدد سخت کوششوں کے آج تک اس کا جواب نہ ہوسکا۔ کتاب کے قبول عام اور مفید کار ہونے کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ آج روئے زمیں پر شاید ہی کوئی زندہ اور شائستہ زبان ہوگی۔ جس میں سعدی کی گلستان کا ترجمہ موجود نہ ہو۔ علاوہ ازیں دنیائے اسلام کی مشہور درسی کتاب ہے۔ بایں ہمہ گلستان کا دامن اس نام نہاد فحش گوئی سے پاک نہیں۔ باب عشق اس کا شاہد ناطق ہے۔ اس میں سعدی نے زاہد یا رند، عالم یا جاہل، امیر یا فقیر کسی کو نہیں چھوڑا۔ سب کا پول کھول دیا ہے۔

۳- امیر خسروؒ دہلوی

امیر خسروؒ عاشق رسول ہیں۔ آپ کا نعتیہ کلام مشہور عام ہے۔ صوفی شاعروں کی صف اول میں آپ کا شمار ہے۔ ہندوستان کے مایہ ناز شاعر اور حضرت نظام الدین اولیاؒ دہلوی کے بڑے چہیتے مرید ہیں۔

"ہشت بہشت) اور "شیریں خسرو" آپ کے خمسہ کی مشہور مثنویاں ہیں۔ "ہشت بہشت" میں بہرام گور اور اس کی آٹھ بیگمات اور "شیریں خسرو" میں خسرو پرویز اور شیریں کے وصل اور ہم کناری کے سین امیر مرحوم نے تفصیل سے دکھائے ہیں۔ تشبیہ و استعارہ کی ندرت اور لطافت کی حد ہوگئی ہے۔ عریانی اور فحاشی کا فیصلہ اور اندازہ قارئین خود کرلیں۔

۴- عبدالرحمٰن جامیؒ

جامیؒ مشہور مداح رسول ہے۔ زبردست آخری صوفی شاعر ہے۔ صاحب خمسہ ہے۔ یوسف زلیخا اس کا شاہکار ہے جو فارسی کی مایہ ناز عشقیہ مثنوی ہے۔ یہ قصہ خالص مذہبی ہے اور قرآن کریم میں اسے "احسن القصص" کا معزز لقب عطا ہوا ہے۔ مشہور درسی کتاب ہے۔ جس کو بڑے بڑے تقدس اور فضیلت پناہ عالم اپنی اپنی درسگاہوں میں تعلیم دیتے چلے آرہے ہیں۔

یوسفؑ کی پیغمبرانہ حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے "یوسف زلیخا" میں (ا) ہفتم خانہ اور شب زفاف کو پڑھئے اور وصل وہم کناری کے سین کی داد دیجئے یا اسے

رگیدیئے۔

۵- میر حسنؒ دہلوی

اردو زبان میں میر حسن بڑا ثقہ اور سحرالبیان شاعر ہے۔ اس کی مثنوی "بدر منیر آج تک لاجواب خیال کی جاتی ہے۔ میر حسن وارث کا ہم زمانہ ہے۔ شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کی ہم کناری کا سین اس نے بھی دکھایا ہے۔ قارئیں خود مطالعہ کر کے اندازہ فرمالیں۔

۶- شکسپئر

شکسپئر انگریزی زبان کا مایہ ناز شاعر ہے۔ وہ دنیا کے عدیم النظیر ڈرامہ نویس تصور ہوتا ہے۔ انسانی جذبات کی ترجمانی یا انسانی فطرت کی مصوری اس پر ختم ہوگئی۔

کالج کی اعلیٰ جماعتوں کا انگریزی نصاب اس کے کسی نہ کسی عشقیہ ڈرامہ سے کبھی خالی نہیں ہوتا جس سے ہمارے موجودہ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ شکسپئر کے عشقیہ ڈراموں میں کئی ایسے مقام آجاتے ہیں جو عریانی یا فحاشی سے خالی نہیں ہوتے۔ بعض دفعہ باپ کے منہ سے ایسے الفاظ اپنی لڑکی کے متعلق نکل رہے ہیں۔ جو تہذیب و اخلاق کی عدالت میں ہر طرح قابل مواخذہ ہیں۔

۷- بھرتری ہری

ہندوستان کا مقتدر حکمران ہے۔ سنسکرت کا بڑا عالم اور شاعر ہے۔ وہ عورتوں کے مکروفریب سے تنگ آجاتا ہے۔ آخر بادشاہی چھوڑ کر فقرو درویشی اور گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے۔ عورت کے عشق و محبت کی کھلے الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔ بعض موقعوں پر عریانی یا فحش گوئی کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ باوجود اتنا خدا رسیدہ انسان ہونے کے وہ اپنے دل کی بھڑاس اس طرح نکالتا ہے۔ جو یقیناً دوسروں کے لئے تازیانہ عبرت ہے۔

وارث شاہ اپنے زمانے کا فارغ التحصیل عالم معلوم ہوتا ہے۔ اس کے سامنے عاشقانہ یا صوفیانہ مثنوی کے جس قدر نمونے تھے۔ ان میں سے بعض بڑے پارسا، زبردست معلم اخلاق اور مشہور عاشق رسول صوفی شاعروں کا دامن بھی اس عریانی یا مفروضہ فحش گوئی سے کم و بیش ضرور آلودہ تھا۔ ان کی ان تصنیفات میں سے کئی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں اور متدین علما کی درس گاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ جلیل القدر حکمرانوں کی فرمائشوں پر لکھی گئی تھیں۔ بایں ہمہ ان کی اس کمزوری پر کسی نے حرف گیری نہیں کی تھی۔ لہٰذا وارث نے جب اپنی ہیر میں ہیر اور سہیلیوں کی مذاقیہ گفتگو کو ترنگ میں لکھا۔ تو فحش گوئی کے الزام کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کیونکہ بڑے ثقہ اور بزرگ صوفیوں کے کلام میں بھی اس نے اس رنگ کو تھوڑا بہت ضرور پایا تھا۔

وارث شاہ کی مفروضہ فحش گوئی زیادہ تر "اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی" کا نتیجہ ہے اور وہ اس طرح کہ:-

۱۔ وارث دیہاتی آدمی ہونے کے باعث ہر بات کو بہت سادہ الفاظ اور بے تکلفانہ لہجہ میں ادا کردیتا ہے۔ ہر آدمی اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

۲۔ وارث بڑا قادر الکلام فطری شاعر ہے۔ کسی جذبہ یا کیفیت، کسی واقعہ یا حالت کا پورا پورا سین دکھانا، تصویر کا کوئی رخ غیر مکمل نہ چھوڑنا یا بیان کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے دینا یہ اس کا مخصوص انداز ہے۔ جس کو وہ عموماً" ہر موقع پر قائم رکھتا ہے۔

معرض بحث مقام ہیر اور اس کی سہیلیوں کی وہ مذاقیہ گفتگو ہے جو ان میں ہوتی ہے جب کہ ہیر جوگی سے کالا باغ میں ملاقات کرکے واپس آتی ہے۔ اس مزاحیہ مکالمہ کو وارث نے اپنے مخصوص انداز میں بلا کم و کاست لکھ دیا ہے مگر سب کا سب تشبیہ و استعارہ کے رنگ میں جو اپنے انداز بیان کے لحاظ سے قابل داد ہے۔

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

بعض وارث پرست صوفی اس مزاحیہ مقام کی عجیب دو راز کار تشریحات یا رکیک تاویلات پیش کرتے ہیں۔ جو کسی صائب الرائے ریڈر یا غیر جانبدار ناقد کے لئے چنداں قابل قبول نہیں۔ اسی طرح بعض وارث شیدائی اس حصہ کو الحاقی قرار دیتے ہیں اور اس من گھڑت نظریہ سے یہ دھبہ وارث کے دامن سے دھونا چاہتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ وہ کونسا عقل کا اندھا قادر الکلام پنجابی شاعر گزرا ہے کہ جس نے اپنی خداداد ذہانت کو بلا وجہ وارث کی شہرت و قبولیت کو تباہ کرنے کے لئے ضائع کردیا؟ اس کا جواب ان کو کہیں نہیں بن پڑتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مذاقیہ حصہ بھی وارث ہی کا لکھا ہوا ہے۔ کسی اور

پنجابی شاعر میں اتنی قادر الکلامی کہاں کہ ایسے نازک مقام کو اس قدر لطیف انداز اور بلیغ پیرایہ میں لکھ سکے۔ یہ وارث کا ہی حصہ ہے۔

اب عدل و انصاف کا اقتضا تو یہ ہے کہ جب اور کتابیں وارث کی ہیر سے زیادہ مقدس، معتبر اور داخل نصاب اس قسم کے اشعار ہونے کی وجہ سے مخرب اخلاق یا مخالف مذہب قرار نہیں دی جاتیں تو پھر بیچارے وارث نے کونسا ایسا ناقابل عفو گناہ کیا ہے کہ اس کی کتاب کو فحش، مخرب اخلاق اور مخالف مذہب اور خود وارث کو رند اور فحش گو شاعر قرار دیا جاتا ہے اور یہ ناواجب اور یک طرفہ فتویٰ شاید تا قیامت قائم رہے۔ کسی نے سچ کہا ہے:۔

ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ امر واقعہ ہے کہ ہیر وارث کو اہل علم نے عموماً" اور مذہبی پیشواؤں نے خصوصاً" کبھی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بلکہ ہمیشہ اس کو مخرب اخلاق سمجھا اور اس کے پڑھنے والوں پر لے دے کی۔ اب جائے غور ہے کہ:۔

ہیر مخرب اخلاق بھی ہو۔ تمدن و معاشرت کے حق میں سم قاتل بھی ہو۔ کسی نصاب تعلیمی میں داخل بھی نہ ہو۔ پنجابی جیسی کم مایہ اور غیر علمی زبان میں لکھی بھی گئی ہو۔ مذہبی طبقہ اس کا شدید مخالف بھی ہو تو آخر اس کتاب میں وہ کونسا سحر یا اعجاز ہے کہ باوجود اس قدر وزنی نقائص اور سخت رکاوٹوں کے پھر بھی اس کا بے حد چرچا اور شہرت ہو۔ بعض لوگ اس کو مشعل ہدایت سمجھیں۔

اب لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کتاب میں ضرور کوئی کشش یا اعجاز ہے۔ ورنہ اس قدر ہردلعزیزی اور قبول عام کے معنی کیا۔ ہیر وارث کا یہ اعجاز

دو طرح کا ہے۔

۱۔ ہیر میں متعدد دلچسپ اور مفید مبحث ہیں۔ جو انسان کی دینی اور دنیوی زندگی سے متعلق ہیں مثلاً" بھائیوں کی جائیداد کے لئے باہمی کش مکش، زمیندار رئیسوں میں تمدنی نقائص، روحانی پیشواؤں اور مذہبی عالموں کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی، فقر و درویشی کی حقیقت، عشق و محبت کی کیفیت، انسانی فطرت کی کمزوریوں اور خوبیوں کے صحیح صحیح فوٹو، حقائق و معارف، پند و نصائح وغیرہ۔

۲۔ وارث کی سحر نگاری نے اس عشقیہ داستان کو جیتی جاگتی تصویروں کا ایک مرقع بنا دیا ہے۔ کتاب کو پڑھ کر یا سن کر دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے اور ہر ریڈر غالب مرحوم کے اس مشہور شعر کا مصداق بن جاتا ہے:۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا وہ بھی میرے دل میں ہے

ضیا صاحب کے بعد پروفیسر سید علی عباس جلالپوری صاحب نے سید وارث شاہ پر کیے جانے والے اعتراضات کا یوں جواب دیا۔ جو ہرچند طویل ہے بلکہ ان کی تصنیف "مقالات وارث" کا پورا ایک باب ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ اس کا مطالعہ وارث شاہ کے مداحوں اور مدافعت کاروں کے لئے ہی نہیں دوسروں کے لیے بھی مفید رہے گا۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ وارث شاہ کے معترفین کہتے ہیں کہ:

۱۔ وارث شاہ نے ہیر (کتاب) کا دامن فحاشی سے داغ دار کردیا ہے۔

۲۔ عورت کی تنقیص کی ہے۔

۳۔ ہندوؤں کی کتھائیں لکھی ہیں۔

اوراق آئندہ میں ہم دیکھیں گے کہ یہ اعتراضات کس حد تک درست ہیں۔ سب سے پہلے ہم فحاشی کے الزامات کو دیکھیں گے۔

فحاشی مذہب، اخلاق، قانون اور ادب و فن کا کا ایک مشترک اگرچہ اختلافی مسئلہ ہے۔ بعض کتابیں جنہیں انگلستان میں فحش سمجھ کر ممنوع الاشاعت قرار دیا گیا ہے اضلاع متحدہ امریکہ میں بے روک ٹوک چھپتی ہیں اور جنہیں اضلاع متحدہ امریکہ میں چھاپنے کی اجازت نہیں ہے ان کی اشاعت پر فرانس، سویڈن اور ڈنمارک میں کوئی قدغن نہیں ہے۔ حالانکہ یہ سارے ممالک عیسائی ہیں اور ایک ہی ضابطہ قانون (رومن لا) کے پابند سمجھے جاتے ہیں۔ ان حالات میں قدرتاً" یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا کوئی معیار ایسا بھی ہے جس کی بنا پر ہم کسی نظم یا نثرپارے کو فحش قرار دے سکیں؟ اس سوال کے جواب کی تلاش میں ہمیں تمدن کے ابتدائی دور سے رجوع کرنا پڑے گا۔

زرعی انقلاب کے بعد جو مذاہب وجود میں آئے ان کا اساسی تصور قدرتاً" بار آوری اور زرخیزی پر مبنی تھا۔ فصلوں کے پنپنے کا انحصار بروقت مینہ برسنے پر تھا۔ اس لئے برق و رعد کے دیوتا کی پرستش کا آغاز ہوا۔ ارض کی کوکھ سے فصلیں اگتی تھیں۔ چنانچہ مادر ارض، اور مہربان اور کیرئی کے نام سے ارضی دیوی کی پوجا ہونے لگی۔ کھیت میں ہل چلانے کا عمل اور جنسی ملاپ کا فعل یکساں طور پر ثمر آور تھے اس لئے جنسی اعضا اور جنسی ملاپ کو زرعی معاشرے کے ابتدائی دور میں بیش از بیش اہمیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ مصر قدیم، سمیریا اور موہن جودڑو کی شہری ریاستوں میں اعضائے تناسل کی پوجا بڑے ذوق و شوق سے کی جاتی تھی۔ ارضی

دیویوں کے معبدوں میں ہزاروں "دیو داسیاں" رکھی جاتی تھیں جن سے دیوی کے نام پر چند سکے دے کر پجاری اور یاتری فیض یاب ہوتے تھے۔ اس زمانے کے بت پرستوں کا خیال تھا کہ اس "مقدس جنسی ملاپ" سے اراضی کی زرخیزی کو تقویت پہنچتی ہے۔

انسان ذی شعور و ذی عقل ہونے کے باعث اپنے فطری تقاضوں کی تشفی ایسے طریقوں سے کرتا ہے جو اسے حیوان سے ممتاز کرتے ہیں۔ عشق و محبت نے جنسی ملاپ کو خاص انسانی شائستگی کا پیرایہ اظہار بخشا ہے۔ عشق وہ کٹھالی ہے جس میں حیوانیت کی الگ ہو جاتی ہے اور انسانیت کا سونا بکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ شکسپیئر ڈینس اور ادنس میں لکھتا ہے۔

Love Surfeits Not Lust Like a Glutton Dies

Love is All Truth Lust Full of Forged Lies

آرٹ حسن کی ترجمانی کرتا ہے۔ حسن عشق کا پروردہ ہے۔ عشق جنسی جبلت کا زائیدہ ہے لہٰذا جب عشق و محبت کے حوالے سے ادبیات اور آرٹ میں جنسی ملاپ کا ذکر آئے گا تو ہم اسے فحش نہیں کہہ سکتے۔ فحاشی جذبہ ہوس Lust کی غیر جذباتی Cold-Blooded تعبیر و ترجمانی کا نام ہے۔ مزاحاً" جنسی ملاپ کا ذکر کیا جائے تو بھی اسے فحاشی نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ سامع بے اختیار مسکرانے لگتا ہے یا کھلکھلا کر ہنس دیتا ہے۔ یہ ہنسی نہ صرف جذبہ ہوس کے بھڑک اٹھنے میں مانع ہوتی ہے بلکہ دل کے انبساط اور ذہن کے پھیلاؤ کا باعث بھی ہوتی ہے۔ یہی بات ہم ہجو یا گالی کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا ردعمل شکرخند کا باعث نہیں ہوتا۔ بلکہ دل میں تلخی اور چبھن پیدا کرتا ہے۔ ہجو دل کے پھیلاؤ کے

بجائے انقباض کا باعث ہوتی ہے۔ احساس کی یہ جراحت ہجو یا گالی کو فحش بنا دیتی ہے۔ کیونکہ گالی دینے والا یا ہجو کرنے والا مقام انسانیت سے گر جاتا ہے۔ عشق و مزاح دونوں قلب و نگاہ کی رفعت اور انبساط کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا فن کارانہ اظہار لازماً فحاشی سے پاک ہوتا ہے۔

عصمت فروشی اور فحاشی لازم و ملزوم ہیں لیکن عشق و محبت کا اعجاز سمجھئے یا آرٹ اور ادبیات کی کرامات جانئے کہ دنیائے ادب میں کسبیوں کے بعض کردار ایسے بھی ہیں جن پر فحاشی کی زد نہیں پڑتی مثلاً زولا کا "نانا"۔ داودے کی "سیفو"۔ موپاساں کی "چربی کی گیند"۔ رسوا کی "امراؤ جان ادا" کالیداس کی "وسنت سینا"۔ عشق یا وطنیت کے جذبات نے اسفل کو اعلیٰ اور ناپاک کو پاکیزہ میں بدل دیا ہے۔ سومرسٹ ماہم نے بھی کسبیوں کی زندگی کی تصویر کشی کی ہے لیکن لذتیت کے باعث اس کے کردار قحبہ خانے کی سطح سے بلند تر نہیں ہوسکے اس کا جواز عام طور سے حقیقت نگاری کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ بے شک عصمت فروشی ایک حقیقت ہے لیکن فن کار یا ادیب کا منصب زندگی کے حقائق کو من و عن پیش کرنا نہیں ہے کہ اس صورت میں ادب محض صحافت بن کر رہ جائے گا۔ بلکہ انہیں ایسی ہیئت عطا کرتا ہے جو ہوس انگریزی کی میل کچیل کو دور کرکے انسانیت کے کندن کو اجاگر کر دکھائے۔ فن کار اور ادیب ایک کیمیاگر کی طرح معمولی دھاتوں پر فن کارانہ عمل کرکے انہیں زر خالص یا آرٹ میں تبدیل کردیتا ہے۔ جو کیمیاگر مس خام کو مس خام ہی کی صورت میں پیش کرے گا اسے ہم کیمیاگر نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح جو ادیب یا فن کار زندگی کے حقائق کو اپنے اصل معروضی رنگ میں پیش کرتا ہے وہ جو کچھ بھی ہو ادیب یا فن کار ہرگز نہیں ہے۔

ہم نے کہا تھا کہ عشق کی طرح مزاح بھی کسی ادب پارے یا نظم کو فحش

ہونے سے بچالیتا ہے۔ اس کی مثالیں عبید زاکانی کے لطیفے اور مثنوی مولانا روم کی بعض حکایات ہیں۔ عبید زاکانی کی ظرافت بے پناہ ہے۔ اس کے لطیفے پڑھتے ہی آدمی بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہوجاتا ہے اور اس طرح ہوس ناکی سے بالاتر ہوجاتا ہے۔ مولانا روم کی بعض حکایات کو فحش کہا جاتا ہے لیکن ان میں بھی کہیں نہ کہیں مزاح کا پہلو نکل ہی آتا ہے۔ جو دل کے انبساط کا باعث ہوتا ہے۔ کنیزو خر کی حکایت کو بھی کدو کے ذکر نے ظریفانہ رنگ دے دیا ہے۔ اسی طرح "خواجہ و غلام"۔ "ملا و کنیزک" اور جوجی و واعظ کی حکایات پڑھ کر بھی انسان بے اختیار ہنس دیتا ہے اور جنسیاتی لذتیت اور ہوس ناکی کی جانب اس کا ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس سوزنی، انوری اور خاقانی کی ہجویں نہایت فحش ہیں کہ ان کا مقصد مخالفین کو ذہنی اذیت پہنچانا ہے۔ یہی سادیت اور طنز ہجو کو فحش بنا دیتی ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں ہم دیکھیں گے کہ وارث شاہ پر فحش نگاری کا الزام کہاں تک درست ہے ہیر ایک مدت کی جدائی کے بعد اپنے محبوب اور چاہنے والے رانجھے سے باغ میں جا کر ملاقات کرتی ہے خلوت میں دونوں کے ارمان سلگ اٹھتے ہیں اور وہ بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ وارث شاہ نے دونوں کو مواصلت کا ذکر صرف ایک شعر میں کیا ہے۔

یارو وگی اندھیرڑی عشق والی اڈ شرم و حیا دی پگ گئی
وارث شاہ رب جوڑ دا جوڑیاں نوں کھب چھاپ اندر اج تنگ گئی

جب ہیر رانجھے کے وصال سے شاد کام ہو کر گھر لوٹتی ہے تو اس کی سہیلیوں کو اس بات کی خبر ہوجاتی ہے اور وہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے فقرے کسنا شروع کردیتی ہیں۔ ان کی فقرے بازی خاصی طویل ہے اور یہی وہ مقام ہے جسے

فحش نگاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چاہنے والوں کی مواصلت کی تفصیل نگاری دنیا بھر کی عشقیہ شاعری کی ایک معروف روایت ہے عربی میں امراؤالقیس فارسی میں نظامی گنجوی، سنسکرت میں جے دیو، لاطینی میں اووڈ نے اس روایت کی آبیاری کی ہے۔ وارث شاہ نے وصال کی منظر نگاری میں حد درجہ ضبط سے کام لیا ہے۔ جب کہ محولہ بالا شاعروں اور تمثیل نگاروں نے اس مقام پر خوب پیر پھیلائے ہیں۔ ہیر کی سہیلیوں نے ہنسی چہل میں جو کچھ کہا اور جس مزاحیہ پیرائے میں کہا اس پر فحاشی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ آج بھی برعظیم پاک و ہند میں نوک جھونک کی یہ روایت موجود ہے۔ اس چھیڑ چھاڑ کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب دلہن عروسی جوڑا پہن کر اور بن سنور کر سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھتی ہے۔ اس کی بیاہی ہوئی سہیلیاں اشاروں اور کنایوں میں مزاحاً" آئندہ پیش آنے والی واردات سے اسے باخبر کرتی ہیں۔ ان کی باتیں سن سن کر کنواری لڑکیاں پلوؤں میں منہ چھپا چھپا کر ہنستی ہیں اور ان کے چہرے شرم سے لال بھبو کا ہوہو جاتے ہیں۔ دلہن سسرال سے لوٹ کر آتی ہے تو بڑی بوڑھیوں سے الگ تھلگ ایک اور مجلس بپا ہوتی ہے۔ سہیلیاں دلہن کو گھیر لیتی ہیں اور کرید کرید کر شب زفاف کی واردات اس سے پوچھتی ہیں۔ دلہن جھینپ جھینپ جاتی ہے اور ہولے ہاتھوں سے انہیں مار مار کر الگ کرنا چاہتی ہے لیکن وہ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ آخر اسے کچھ نہ کچھ بتانا ہی پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں مذاحیہ پیرائے میں ہوتی ہیں۔ وارث شاہ نے اپنے معاشرے کی اس روایت کی شرح و بسط سے ترجمانی کی ہے۔ ازبسکہ ان کا پیرایہ بیان فن کارانہ اور مزاحیہ ہے۔ اس لئے ان اشعار پر فحاشی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

وارث شاہ نے گڈریوں، ملاحوں اور جاٹوں کی زبان سے کہیں کہیں ایسا روز مرہ بھی استعمال کیا ہے جس پر بعض لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ

دیہاتیوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ علما کی زبان بولیں گے۔ وارث شاہ نے یہاں بھی مقتضائے حال کا خیال رکھا ہے۔

وارث شاہ پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے جابجا عورت کی تنقیص کی ہے۔ تنقیص زن کی روایت پدری نظام معاشرہ سے یادگار ہے جس میں مرد کو عورت پر برتر سمجھا جاتا تھا۔ زرعی انقلاب کے اوائل میں اکثر اقوام عالم میں مادری نظام معاشرہ قائم تھا اور عورت کو اس معاشرے کا مرکز و محور سمجھا جاتا تھا عورت ہی نے پہلے پہل بیج بونے اور فصلیں اگانے کا راز دریافت کیا تھا۔ مرد شکار کے لئے جنگلوں کا رخ کرتے تو عورت فراغت کے وقت میں زمین کھود کر بیج بونے کے تجربے کیا کرتی ابتدا میں گیہوں ایک جنگلی خود رو پودا تھا۔ عورت بیج بو کر گندم کے پودے اگانے لگی۔ مرور زمانہ سے مرد فصلیں اگانے کی اہمیت سے آشنا ہوا اور اس نے دریاؤں کے کناروں پر کھیتی باڑی کا آغاز کیا۔ زمین کے بطن سے فصل اگتی تھی اور عورت کی کوکھ سے بچے پیدا ہوتے تھے۔ اس لئے عورت زمین کی تمثیل بن گئی اور مادر ارض کی صورت میں علم الاصنام میں نمودار ہوئی۔ مادری نظام معاشرہ صدیوں تک قائم رہا۔ اس میں مرد کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ بچے اپنی ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے لیکن زرعی معاشرے کے استحکام کے ساتھ صورت حالات بدل گئی۔ بستیاں شہروں میں تبدیل ہوگئیں۔ ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ طاقتور سردار بن بیٹھے اور اراضی کے سیر حاصل قطعات پر متصرف ہوگئے۔ لوٹ کھسوٹ کے شوق میں فوجی دستے مرتب کیے اور جنگ و جدال کا آغاز ہوا۔ مرور زمانہ سے پرانی قدریں بدل گئیں۔ مرد کی سیادت عورت پر قائم ہوگئی کیونکہ وہ زیادہ شہ زور اور جری تھا۔ ذاتی املاک کا تصور جب' سیاست' قانون' مذہب اخلاق میں بار پاگیا۔ حتیٰ کہ عورت بھی شخصی املاک بن کر رہ گئی۔ عہد

نامہ قدیم میں عورت کو گائے بیل کے ساتھ ذاتی املاک ہی میں شمار کیا گیا ہے۔ مرد نے عورت کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو وہ اپنے بیل سے کرتا تھا۔ چنانچہ عورتوں کو بھی ڈھور ڈنگروں کی طرح سربازار خریدا اور بیچا جانے لگا۔ سلاطین و امرا نے ہزاروں کنیزیں اپنے محلوں میں ڈال لیں۔ تاجروں نے قحبہ خانے قائم کیے اور عصمت فروشی کا کاروبار مندروں کے باہر بھی ہر کہیں پھیل گیا عورت مرد کی تفریح طبع کے لئے محض ایک کھلونا بن کر رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ عورت کو وہی کچھ بننا تھا جو مرد اسے بنانا چاہتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے دروازے اس پر بند تھے۔ عورت کو اخلاقی پستی اور ذلت کے گڑھے میں دھکیل کر مرد الٹا اس پر طعن کرنے لگا اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔

کتابیں لکھنے والے مرد تھے اس لئے انہوں نے عورت کا ذکر نہایت حقارت سے کیا اور انہیں مکار، فریبی، ہرجائی، ناقابل اعتماد ہوس پرست ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس تذلیل و تنقیص کی تہہ میں دراصل مرد کا احساس جرم کارفرما تھا۔ وہ لاشعوری طور پر جانتا تھا کہ خود اس نے عورت کو پستی کی اس حد تک پہنچایا ہے۔ احساس جرم کی اس خلش سے نجات پانے کے لئے اس نے عورت کو تمام مصائب کا پتلا ثابت کیا۔ ادبیات عالم میں تنقیص زن کی روایت ہر کہیں دکھائی دیتی ہے۔ "بسا اوقات عورتیں اپنے شوہر کو ننگ و عار کے تلخ گھونٹ پلاتی ہیں اور آشناؤں کو محبت کا شیرین ذائقہ چکھاتی ہیں"۔

(ابو العلامعری - لزومیات)

عورت کا داغ ایسا ہے جیسا کہ لگڑ بگڑ کا۔ (رگ وید)

عورتوں کے حربے ہیں: دھوکا دینے والی باتیں، مکر، قسمیں کھانا، بناوٹی جذبات کا اظہار جھوٹ موٹ کے ٹسوے بہانا، بناوٹی مسکراہٹیں، دکھاوے

کے دکھ درد کا اظہار' بے معنی خوشی' تغافل' بے معنی سوالات پوچھنا' خوشحالی اور افلاس میں بے نیازی کا اظہار' نیک و بد میں تمیز نہ کرنا' چاہنے والوں کی طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھنا۔" (سوک سپ تتی۔ سنسکرت

ایک اچھی بیوی سفید کوے کی طرح نایاب ہے۔" (جونیاں)

عورت ایک مندر ہے جسے بدروؤں کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے۔" (ولی کلیمنٹ)

الف لیلہ اور دی کامیراں بر کا چیو وغیرہ داستانوں میں عورت کے مکروفریب کے قصے مزے لے لے کر بیان کیے گئے ہیں اور عورت کی خوبیوں سے قطع نظر کی گئی ہے۔ وارث شاہ نے بھی کہیں اس روایت کی ترجمانی کی ہے۔

ع اعتبار ناہیں قول رن دے تے اونہاں ماپیاں دی جنہاں جایاں نے
ع وارث رن' فقیر' تلوار' گھوڑا چارے تھوک کسے دے یار ناہیں
ع رناں پچیاں نوں کرن چا جھوٹھے رناں قید کراندیاں راہیاں نوں
ع جنہاں ڈیباں پالکے سریں چایاں رناں تنہاں دیاں مول نہ سکیاں نے
ع وارث ذات دی رن بے وفا ہندی پوری نال نہ کسے اتاریو نی
ـ راتیں تر دیاں نے چھتی پتناں تے دنے بھولیاں لل وللیاں نے
دنے نارکاں ستر دیاں بیبیاں نے سیحاں رات نوں مار تھرتھلیاں نے
پچھے چرخڑا رلے سڑن جوگا کدی چار نہ لاہیاں چھلیاں نے
جتھے گبھرو ہون جا کھیہن اوتھے پرہے مار کے بہن پسلیاں نے

وارث شاہ کی سلامتی طبع اور انصاف پسندی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اس

قدیم روایت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس سے انحراف بھی کیا ہے وہ عورتوں کی خوبیوں اور مردوں کی کوتاہیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ جب رانجھا عورت کی برائی کرتا ہے تو سہتی اسے جواباً کہتی ہے کہ تو عورتوں کی برائی کرتا ہے۔ ہم مردوں کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں جو راہ راست سے بھٹک کر گمراہ ہو گئے ہیں۔ اپنی بیویوں سے دور بھاگتے ہیں اور غیر عورتوں کو ورغلاتے رہتے ہیں۔ مرد حرص و ہوا کے بندے ہیں اور ہر وقت حرام کاری پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ جس عورت کی مرد خبر تک نہ لے اور اس کے حقوق ادا نہ کرے تو اس کا گمراہ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس میں بھی قصور مرد ہی کا ہے۔ جو مرد خود غیر عورتوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے اس کی اپنی بیوی کیسے محفوظ رہ سکتی ہے۔ عورتوں کی برائی نہ کر۔

سہتی آکھدی رن نوں کریں بدوں اساں مرد بھی ڈھٹرے بھالڑے وے
راہ رب رسول دا چھڈ جنہاں پھڑے آن اپسھڑے چالڑے وے
رغبت حق حلال دے نال ناہیں کرن نویں نوں نویں ادھالڑے وے
گھریں راستی دی ناہیں گنڈھ پھولن کھولن باہر حرام دے نالڑے وے
غلبہ کام دا کل ہے مرد تائیں جھڑے حکم دے کے رب پالڑے وے
بھلا دس کیکوں رن رہے ایویں جہدی سرت نہ خصم سنبھالڑے وے
گھریں چوراں دے مور وی آن پوندے ایہناں ہور کدھر پامو گالڑے وے
حق عورتاں دے مندا بول ناہیں جڈو مرد بھی ہین منہ کالڑے وے

اس ضمن میں ہیر اور رانجھے کا ایک مکالمہ بھی قابل ذکر ہے ایک دن رانجھے نے ہیر سے کہا کہ شریعت کی رو سے عورت کا قول نامعتبر ہے۔ خدا نے قرآن میں بھی کہا ہے کہ عورت کا مکر بہت بڑا ہے۔ جن اور عورت کا مرشد شیطان ہے

جو انھیں مکروافترا کا سبق دیا کرتا ہے عورتیں سچ کو بھی جھوٹ کر دکھاتی ہیں۔ عورتوں، لوڈنوں، پوستیوں اور بھنگیوں کی بات کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

شرع وچ منظور نہ قول رناں رانجھا ہیر نوں آکھ سناوندائی
مکر رن دے جیڈ نہ مکر کوئی رب وچ قرآن فرماوندائی
مرشد جن تے رن دا بجھ شیطان جہڑا افترا مکر پڑھاوندائی
رناں پچیاں نوں کرن چا جھوٹے مرد آن دے وچ سماوندائی
رناں منڈیاں، پوستی، بھنگیاں دا اعتبار نہ قول لیاوندائی
وارث شاہ جے قول تے دیہن پہرہ پت مہر دا چاک سداوندائی

ہیر جواب دیتی ہے کہ عورت کی برائی مت کرو۔ عورت تو چتا پر جل مرتی ہے۔ مرد میں عورت جیسا حوصلہ کہاں۔ عورت تو عشق میں مال دولت املاک سب پر لات مار دیتی ہے۔ لیلیٰ قیس کے لئے رسوا اور خوار ہوئی۔ سوہنی محبوب کی خاطر دریا میں ڈوب مری۔ زلیخا نے پیار کی خاطر سرداری کو ٹھکرادیا۔ عورت پیار میں میکہ، سسرال، عزیز اقارب چھوڑ دیتی ہے اور دولت کو ہیچ سمجھتی ہے۔ سسی پنوں کی تلاش میں شہید ہوئی۔ شیریں نے صدق و صفا کا ثبوت دیا۔ جتنے بھی غوث اولیا دنیا میں ہوئے ہیں سب عورت کی کوکھ ہی سے پیدا ہوئے تھے۔ حوا اور آدم میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا رتبہ ایک جیسا ہے۔ وارث شاہ بھی جانتا ہے کہ ضبط و حوصلہ عورت جیسا کسی میں نہیں ہو سکتا۔

ہیر آکھدی رناں نوں نند ناہیں رن چیہ چڑھی چتا جال دی اے
ہمہ رن جیڈا مرد ناہیں کردا رن مال تے مل نہ بھالدی اے
مجنوں یار پچھے لیلا خوار ہوئی سوہنی اپنے آپ نوں گالدی اے

زلیخاں چھڈ سرداریاں ہوئی عاجز جگی پا نہ جان سنبھالدی اے
بیکے ساہو دے سکیاں نوں رئے پچھا غمی کرے نہ دولتاں مالدی اے
سسی ہو شہید وچ تھلاں موئی شیریں صدق یقین وکھالدی اے
ولی غوث سب رناں تھیں ہوئے پیدا حوا سمجھ لے آدموں نالدی اے
ہٰھ رن دے جیڈ نہ کوئی کردا وارث شاہ نوں خبر ایس حالدی اے

ہیر خود بھی مہروفا کی پتلی تھی۔ اس کی زباں سے عورت کا یہ دفاع موثر ذکر ہے۔ یہ نظریہ نہایت متوازن ہے کہ آدم و حوا کا مرتبہ ایک جیسا ہے۔ کلاسیکی شاعری اور ادب میں مرد عورت کی برابری کا خیال کم ملے گا۔ اسے وارث شاہ کاذاتی اجتہاد سمجھنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر عورت خود فراموشی، ایثار نفس، قربانی اور ضبط و حوصلہ کا پیکر ہے۔ وارث شاہ نے عورت کی ایسی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو کم از کم عشق و محبت کے عالم میں بہت ہی کم مردوں کو ہوتی ہیں۔ بائرن نے سچ کہا ہے کہ "عشق مرد کی زندگی کا محض ایک حصہ ہے لیکن عورت کی تو زندگی یہی ہے"۔

وارث شاہ پر تیسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کی کتھائیں بہت لکھی ہیں۔ یہ اعتراض عدم تدبر پر مبنی ہے ظاہر ہے کہ وارث شاہ جب ہیر رانجھا کا قصہ نظم کرنے بیٹھے تھے تو ان کا مقصد ہندوؤں کی کتھائیں لکھنا نہیں تھا۔ ہندوؤں کی روایات کا ذکر جہاں کہیں بھی آیا ہے ضمنا" آیا ہے۔ یا تلمیحات کی صورت میں آیا ہے۔ جس زمانے میں ہیر لکھی گئی تھی ہندوؤں کے مذہبی خیالات اور ضمنیاتی قصے پنجابی دیہات کے معاشرے میں اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ انکے ذکر سے قطع نظر کرنا از قبیل محال تھا۔ رانجھے کا جوگی بننے کا واقعہ اس قصے کا ایک اہم جز ہے۔ جب تک وارث شاہ یوگ کے عقائد، آداب اور طور طریقوں

سے کامل واقفیت بہم نہ پہنچاتے ان کے لئے اس واقعہ کے متعلقات سے انصاف کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ جیسا کہ ہم ان کی علمیت کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ انہیں کم از کم گیتا' شبد پران اور یوگ و ششتا پر پورا عبور حاصل تھا۔ اور انہوں نے یوگ بارے میں بصیرت نامہ حاصل کر کے قلم اٹھایا تھا۔ ان کے سوانح حیات پر گمنامی کے تاریک پردے پڑے ہیں۔ اس لئے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ علوم انہوں نے کہاں سے حاصل کیے تھے۔ بھگتی کی تحریک صوفیہ وجودیہ کے عقائد سے متاثر ہوئی تھی اور مرود زمانہ سے ویدانت اور تصوف کے خیالات آپس میں گھل مل گئے تھے۔ جیسا کہ بھگت کبیر اور گورو بابا نانک کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے سماوھی اور مراقبے 'پرانایام اور حبس دم' تجرد اور سنیاس' تسبیح اور مالا میں واضح مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ وارث شاہ نے ایک وجودی صوفی کی حیثیت سے یوگ اور ویدانت کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے وہ نہایت اعتماد سے اور پوری بصیرت سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ وارث شاہ کی یہ بصیرت اچنبھے کا باعث بھی نہیں۔ حضرت میاں میران کے مرید ملاشاہ بدخشی اور ملا شاہ بدخشی کے پیرو ملا محسن فانی کاشمیری صاحب دبستان المذاہب یوگ اور ویدانت کے دقایق و رموز سے بخوبی آشنا تھے۔ ان نظریات کا علم وارث شاہ کی ہمہ گیر فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔ اس خوبی کو عیب قرار دینا زیادتی ہے۔

اعتراضات کا رد لکھنے سے ہمارا مقصد وارث شاہ کی طرف سے معذرت خواہی کرنا نہیں ہے نہ یہ ثابت کرنا ہے کہ ہیر کوتاہیوں سے اور خامیوں سے پاک ہے۔ "ہیر" میں بے شک خامیاں ہیں جیسے کہ دنیائے ادب و شعر کے تمام شاہکاروں میں بالعموم دیکھنے میں آتی ہی۔ ہمارے خیال میں وارث شہ کی ایک خامی یہ ہے کہ چند ایک مقامات پر انہوں نے مقتضائے حال کو مجروح کیا ہے۔ مثلاً"

چوچک کے سامنے گاؤں کی جوان لڑکیاں جس پیرائے میں کیدو کی شکایت کرتی ہیں وہ بلا شبہ فحش ہے اور مقتضائے حال کے منافی بھی۔ دیہاتی لڑکیاں ایسے واشگاف انداز میں اپنے بڑے بوڑھوں کے سامنے باتیں نہیں کیاکرتیں۔ ہیر اور قاضی کے مکالمے میں ہیر قرآن، فقہ اور حدیث سے بے تکلف حوالے دیتی ہے۔ اس کے استدلال کی عالمانہ روش سے یوں لگتا ہے جیسے کوئی جید عالم مناظرہ کر رہا ہے۔ ظاہراً یہاں وارث شاہ جوش نمود کی رو میں بے اختیار بہہ گئے ہیں۔ اور ہیر کی زبانی اپنے علمی تبحر کا مظاہرہ کیاہے۔ یہی حال رانجھے اور سہتی کی تکرار کا ہے۔ اس میں بھی کہیں کہیں رانجھے اور سہتی کی زبانی دقیق علمی نکتے بیان کیے گئے ہیں۔ جس سے مقتضائے حال کی جرحت ہوئی ہے۔ ہیر، رانجھے اور سہتی سے علمی تبحر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ مقامات اس لئے بھی کھٹکتے ہیں کہ اکثر و بیشتر وارث شاہ نے مقتضائے حال کا خاص طور سے خیال رکھا ہے جس نے ہیر کو حقیقت نگاری کا رنگ عطا کیا ہے۔

مقامات وارث شاہ

نقد ادب کی معروف روایت ہے کہ کسی شاعر کا مقام معین کرنا ہو تو اس کا تقابلی موازنہ اس کے کسی ہمسر و ہم پایہ سے کرتے ہیں مثلاً گوئٹے کا ذکر دانتے اور ورجل کا تذکرہ ہومر کے حوالے کیا جاتا ہے۔ حافظ شیرازی کی غزل کا تجزیہ خواجو کی غزل کی نسبت سے کرتے ہیں لیکن وارث شاہ کی اس قدر جامع حیثیات ہیں کہ نہ ان کا موازنہ کسی شاعر سے کیا جا سکتا ہے اور نہ ہیر کو شاعری کی کسی روایت سے وابستہ کرنا ممکن ہے۔ اگر ہیر محض ایک عشقیہ قصہ ہوتی تو ایسا کرنا

سہل تھا لیکن مشکل تو یہی ہے کہ "ہیر" محض ایک عشقیہ قصہ نہیں ہے۔ ابولفرج اصفہانی کی کتاب "الاغانی" کو "دیوان العرب" کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں عربی معاشرے کے تمام پہلو منعکس ہوئے ہیں۔ اس پہلو سے ہم "ہیر وارث شاہ کو" "دیوان پنجاب" کہہ سکتے ہیں کہ اس میں دیس پنجاب کا معاشرہ پوری آب و تاب کے ساتھ متشکل ہوا ہے لیکن یہ مماثلت اسی ایک پہلو تک محدود ہے کیونکہ کتاب الاغانی میں بیسیوں کہانیاں ہیں جبکہ "ہیر" ایک مسلسل منظوم قصہ ہے۔ اصناف ادب میں مقامہ ا۔ (ایسی کہانی جس کا مرکزی کردار کوئی لاابالی مہم جو ہو) ایک ایسی صنف ہے جو ہیر وارث شاہ کے قریب تر ہے لیکن دقت یہ ہے کہ رانجھا محض ایک لاابالی مہم جو ہی نہیں ہے بلکہ عاشق صادق بھی ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وارث شاہ کی شاعری کلاسیکی ہے، رومانوی ہے یا رمزیاتی ہے۔ بے شک "ہیر" میں یہ ساری روایات کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں لیکن اس پر کسی ایک روایت کی چھاپ نہیں لگائی جا سکتی۔

وارث شاہ کے یہاں بھی جاگیردارانہ معاشرے کے زوال کا گہرا شعور موجود ہے۔ انہوں نے ستم رسیدہ عوام کی مظلومیت کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ آج سے کم و بیش دو سو سال پہلے کے جاگیردارانہ نظام میں ان حقائق کا شعور و ادراک بلاشبہ وارث شاہ کی دیدہ وری کی بین دلیل ہے۔ فلسفہ یونان میں ظالموں کو جان سے مار دینا ایک مستحسن فعل ہے۔ وارث شاہ کی اخلاقیات کا بھی یہ ایک اہم اصول ہے۔ فرماتے ہیں۔

ع وارث شاہ جے ماریئے بداں تائیں تنہاں خون نہ دیونے آوندے نے

(جو بدوں کو جان سے مار دیں ان پر قصاص واجب نہیں ہوتا)

خودداری، خودشعوری اور کشف ذات کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ع تینوں رب شہباز بنایا سی بنیوں کرتباں نال توں ال آپے

(خدا نے تجھے شہباز بنایا تھا اپنے کرتوتوں سے تو چیل بن گیا ہے)

اخلاقیات کے یہ اصول ہمیں اخلاق جلالی یا اخلاق ناصری میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے۔ ان کتابوں میں فروتنی، عاجزی اور مسکنت کی تعلیم دی گئی ہے۔ بدوں کے خلاف بغاوت کی تلقین کرنا اور عوام کو اپنی شہبازی کا احساس دلانا وارث شاہ کے انقلابی ذہن کی نشاندہی کرتا ہے۔

مسلمان شمالی ہند میں وارد ہوئے تو ان کی زبان فارسی تھی۔ ترک سلاطین بھی گھروں میں ترکی بولتے تھے اور دربار میں فارسی میں بات چیت کرتے تھے۔ محمود غزنوی اور جلال الدین اکبر کے دور ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اور عسکری غلبے کے زمانے تھے۔ اس لئے عنصری، عسجدی، فیضی، اور عرفی کی شاعری میں ایک خوش آئند حیات پرور طنطنے کا احساس ہوتا ہے اور اورنگزیب کے بعد مغلیہ سلطنت کو زوال آگیا۔ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور راجپوتوں نے چاروں طرف شورش برپا کر دی۔ اس زوال پذیر معاشرے کا عکس معاصر فارسی شعرا کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ "اسلوب ہندی" کا ابتدائی دور اظہار و بیان کی شگفتگی کا آئینہ دار تھا۔ مرور زمانہ سے خلوص بیان کی جگہ دور از کار استعاروں اور نام نہاد "خیال بندی" نے رواج پایا اور فارسی غزل سے شعریت کی روح غائب ہو گئی۔ فارسی شاعری کے اس تنزل کے ساتھ اردو شاعری کا آغاز وابستہ ہے۔ چنانچہ اردو غزل فارسی غزل ہی کا چربہ تھی۔ اس کے اسالیب بیان، تشبیہات، استعارے، تلمیحات اور محاورے فارسی ہی سے مستعار تھے۔ اس لئے قدرتاً اردو شاعری

شروع ہی سے زوال پذیری کا شکار ہو گئی۔ تین شعرا البتہ اس زوال پذیری سے محفوظ رہے۔ سودا، غالب، نظیر اکبر آبادی۔ غالب اور سودا اس لئے کہ ان کے آبا کو ہندوستان میں وارد ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس لئے وہ زوال پذیری کی کان نمک میں نمک نہیں ہو پائے تھے۔ اسی لئے ان کے کلام میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی قلندر تھے لہٰذا زوال پذیر درباری معاشرے سے ان کا ذہنی و ذوقی رشتہ قائم نہ ہو سکا۔

فارسی کے کئی شاعروں نے ہیر رانجھے کا قصہ نظم کیا ہے۔ سعید سعیدی کی مثنوی افسانہ دلپذیر، لائق کی ہیر رانجھا، فقیراللہ آفریں کی قصہ ہیر رانجھا، احمد یار خاں کی داستان ہیر رانجھا، میر قمرالدین کی مثنوی قصہ ہیر رانجھا، آرام کی مثنوی ہیر رانجھا اور باقی کولابی کی مثنوی قابل ذکر ہیں لیکن اسالیب، تشبیہات اور تلمیحات کے لحاظ سے ان مثنویوں میں اور نظامی گنجوی ملا جامی یا امیر خسرو کی مثنویوں میں کچھ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں معاصرت کے اس شعور کا فقدان ہے جس کی اہمیت گوئٹے نے یہ کہہ کر واضح کی تھی ا۔

"ہر معاصر ادیب کو یہ بات معلوم کرنا ہو گی کہ اس کے معاصرین کی داخلی حس زمان کیا ہے۔ ایک ادیب یا ایک مصور اس شے کا زیادہ واضح شعور رکھتا ہے ادیب کا کام ہی اس معاصرت میں زندگی گزارنا ہے۔"

وارث شاہ کو معاصرت کا شعور کامل ارزانی ہوا تھا۔ ہم گزشتہ اوراق میں اس کا ذکر تفصیل سے کر چکے ہیں۔ مزید وضاحت کے لئے ہم باقی کولابی اور ہیر وارث شاہ سے دو تقابلی اقتباسات دیں گے۔ باقی ہیر کے حسن و جمال کی تعریف میں کہتا ہے۔

هیر آں صنمی سمن عذارے — کو راست بہر طرف ہزارے
بردہ گل گلشن جوانی — نو رستہ نہاں زندگانی
سر تا قدمش جو آب حیواں — کو داو بصد ہزار کس جاں
حیراں بجال او جہانے — ہر گوشہ در است ناتوانے
آشفتہ موی او ہزاراں — دل خستہ روی او ہزاراں
از سنبل او بنفشہ در تاب — گشتہ دل صد ہزار بے تاب
از چشم سیاہ پر فن او — از طرز نگاہ کردن او
برخاستہ چشم فتنہ از خواب — بیدار شدہ فتاد بے تاب
نرگس شدہ بے قرار و بیمار — از پای فتادہ رفتہ از کار
از فتنہ گری آں دو جادو — برخاستہ فتنہ ای ز ہرسو
آتش زدہ روی او جہاں را — خوں کرد دل بس عاشقاں را
در حسرت آں دو لعل خنداں — خوں بستہ دل چو من ہزاراں
خوں بستہ دل بسے ازاں لب — شد خستہ دل بسے ازاں لب
زاں پستہ دہاں شکریں لب — خوں بستہ دل ہزار یارب
سر خیل پری وشاں بود ہیر — ہستی جہاں جاں بود ہیر

ان اشعار میں گھسے پٹے استعاروں اور اسالیب کی بھرمار ہے جس سے قطعی مفہوم نہیں ہوتا کہ باقی کولابی کس ملک و قوم کی عورت کا سراپا لکھ رہا ہے۔ یہی سراپا شیریں، عذرا، لیلیٰ، زلیخا کا بھی ہو سکتا ہے۔ وارث شاہ ہیر کے حسن و جمال کی تصویر کھینچتے ہوئے کہتے ہیں:۔

دند چنبے دی کلی کہ ہنس موتی دانے نکلے حسن انار وچوں

لکھی چین تصویر کشمیر جٹی قد سرو بہشت گلزار وچوں
گردن کونج دی انگلیاں روانہہ پھلیاں ہتھ کولڑے برگ چنار وچوں
چھاتی ٹھاٹھ دی ابھری پٹ کھینوں سیب بلخ دے چنے انبار وچوں
دھنی بہشت دے حوض دا مشک قبہ پیڈو مخملی خاص سرکار وچوں
کافور شہنا سرین بانکے حسن ساق ستون مینار وچوں
سرخی ہوٹھاں دی لوہڑ دنداسڑے دا خوجے کھتری قتل بازار وچوں
باہاں ویلنے ویلیاں گبھ مکھن چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں
شاہ پری دی بھین پنج پھول رانی گجھی رہے نہ ہیر ہزار وچوں
سہیلیاں نال لٹک دی ان متی جویں ہرنیاں ترٹھیاں بار وچوں
لنک باغ دی پری کہ اندر رانی حور نکلی چند انوار وچوں
تپلی پیکے دی نقش روم والے لدھا پری نے چند پروار وچوں

ان اشعار میں پنج پھول رانی، لنک باغ دی پری (سہتا) اندر رانی (اندر کی زوجہ) ملکی تلمیحات ہیں۔ دند چنبے دی کلی، کشمیر تصویر جٹی، گردن کونج دی، انگلیاں روانہہ پھلیاں، چھاتی پٹ کھینوں (ریشم کی گیندیں) سرخی ہوٹھاں دی لوہڑ دنداسڑے دا۔ خوجے کھتری قتل بازار وچوں، باہاں ویلنے ویلیاں گبھ مکھن، چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں، جویں ہرنیاں ترٹھیاں بار وچوں جیسی تمثیلیں اور تشبیہات گردوپیش سے لی گئی ہیں۔ جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ہیر اسی ملک کی ایک خوبصورت مٹیار ہے۔

وارث شاہ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہیر کے اوراق میں دیس پنجاب کے معاصر معاشرے کو ہمیشہ کے لئے زندہ کردیا ہے۔ اس پہلو سے شعروادب کو تاریخ پر برتری حاصل ہے کہ تاریخ محض ایک بے جان خاکہ ہوتا ہے

جس میں رنگ شاعری اور قصوں سے بھرا جاتا ہے۔ ہمارے شاہیت کے دور کے مورخین سلاطین و امرا کے سوانح اور ان کے جنگ و جدال کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں عوام گویا ان کے لئے کبھی تھے ہی نہیں۔ چنانچہ ہمیں فرشتہ' خافی خاں بدایونی وغیرہ کی تاریخوں میں انہی لوگوں کے نام یا کام کا ذکر ملے گا جو سلاطین و امرا کے درباریوں اور محلوں سے وابستہ تھے۔ ان کے یہاں سلاطین و امرا کے خواجہ سراؤں' لونڈیوں' اصیلوں' امردوں' قلماقیوں' کسبیوں' فیل بانوں وغیرہ کے حالات مل جائیں گے لیکن ہم کبھی یہ معلوم نہیں کرپائیں گے کہ اس دور کے عوام کیسے گزر بسر کرتے تھے۔ آئے دن کی خانہ جنگیوں سے ان کے روز مرہ کے معمولات کیسے متاثر ہوتے تھے۔ قحط اور وبا میں ان کا کیا حشر ہوتا تھا۔ سلاطین کی عیش و عشرت کا سامان فراہم کرنے کے لئے عوام پر جو بھاری محصول لگائے جاتے تھے وہ ان کے متحمل کیسے ہوتے تھے۔ شاہی کارندوں کو خوشنودی کے لئے اور ان کی تعدی سے بچنے کے لئے انہیں کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔ بددیانت اور قابوچی حکام کس بے دردی سے ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی نذرانوں کی صورت میں ہڑپ کر جاتے تھے۔ زمیندار اور جاگیردار کسانوں کو کس طرح جبروستم کا نشانہ بناتے تھے اور کس طرح ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت غارت کرتے تھے۔ مکار پیر اور ریاکار ملا کس طرح عوام کو غچے دے کر دونوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے۔ عوام سلاطین کے استبداد سے خائف تھے یا ان کے سینوں میں بغاوت کے جذبات بھی کروٹیں لیتے تھے۔ درباری مورخین ان امور کے بارے میں خاموش ہیں۔ ان کی واقعہ نگاری دہلی' آگرہ' لکھنؤ جیسے درباری شہروں کے گرد گھومتی ہے۔ دیہاتی معاشرے کی جھلک شاذونادر ہی ان کے اوراق میں دکھائی دے گی۔

ہیر کے مطالعے سے وارث شاہ کے زمانے کا پنجابی معاشرہ پوری طرح

متشکل ہو کر ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ارسطو نے کہا تھا کہ آرٹ نیچر کی خامیوں کی تلافی کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں شعروادب تاریخ نگاری کے خاکے میں رنگ بھرتے ہیں۔ کم از کم وارث شاہ نے معاصر پنجابی معاشرے کی تصویر کشی کرکے اس عہد کے مورخین کی کوتاہیوں کی بطریق احسن تلافی کردی ہے۔

روسی ناول نگاروں گوگول، ترگنیف، دوستوفسکی، ٹالسٹائی وغیرہ پر نقد لکھتے وقت کہا جاتا ہے کہ ان کے ناولوں میں "روسی روح" پوری طرح منکشف ہوئی ہے۔ یعنی ان میں روسیوں کے اتھاہ غم و الم اور حزن و ملال کا امتزاج اعلیٰ نصب العینوں کی جستجو کے ساتھ ہوا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ دانتے کے "طربیہ خداوندی" میں "اطالوی روح" اپنی تقدس آمیز جمالیت اور گوئٹے کی "فاوسٹ" میں جرمن روح اپنی ہمہ گیر آفاقیت کے ساتھ منعکس ہوئی ہے۔ ہیر وارث شاہ میں پنجابیوں کی شجاعت، وسعت قلب، جوانمردی، زندہ دلی اور دردمندی کا امتزاج عاشقانہ وارفتگی اور رفعت پسندی کے ساتھ ایسے نادر پیرائے میں ہوا ہے کہ دنیائے شعروشاعری کے چند گنے چنے شاہکار ہی ہیر کے مقابلے میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ قرائن و آثار بتا رہے ہیں کہ عنقریب پنجاب زبان کو اس کا کھویا ہوا مقام مل جائے گا۔ جب دیس پنجاب کے شاعر اپنے عظیم اور جیالے عوام کی آرزوؤں، حسرتوں اور ولولوں کی ترجمانی پر نئے سرے سے کمربستہ ہوں گے تو ہیر وارث شاہ ان کے لئے مسلسل ذوقی و لسانی فیضان کا سرچشمہ بن جائے گی۔ ایک وقت ایسا آئے گا جب وارث شاہ کو شعرائے عالم کی صف میں وہ مقام رفیع ارزانی ہوگا جس کے وہ بدرجہ اولیٰ مستحق ہیں اور جس سے ان کی محرومی پورے عالمی ادب کی محرومی بن گئی ہے۔

وارث شاہ کے معتقدات

فارسی کا ایک شعر ہے۔

در سخن مخفی شدم چوں رنگ و بوئے در گلے
ہر کہ خواہد دید' گو اندر سخن بیند مرا

اسی حوالے سے جب ہم ہیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے حمدیہ اشعار ملتے ہیں لیکن وجوہات حمد میں سے (شاید داستان کی ضرورت کے پیش نظر) وارث شاہ نے عشق کو جگ کا مول کرنے کو نمایاں رکھا ہے اور باقی تینوں مصرعوں میں اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ رب پہلے خود اس مرحلہ عشق میں سے گزرا اور نبی رسول (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنا معشوق ٹھہرایا اور اسی لیے ہر فقیر کا مرتبہ عشق ہی سے متعین ہوتا ہے یعنی جس قدر کسی میں خدا اور اس کے رسول کا عشق زیادہ ہوگا اسی قدر اس کا مرتبہ زیادہ ہوگا اور یہ عشق چونکہ کسی کی آرزو کو اپنے اندر پالنا ہے اس لیے عاشق کے لیے رنجوری ہی بھلی ہے۔ اسی بات کو اردو کے معروف شاعر مرزا غالب نے یوں پیش کیا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

اور یوں لگتا ہے کہ وارث کے چوتھے مصرعے میں اسی بات کو بیان کیا گیا ہے کہ کھلے تنہاں دے باغ قلوب اندر جنہاں کیتا اے عشق قبول میاں"

یوں ان مصرعوں کے حوالے سے وارث شاہ زمرۂ عشاق میں شمار ہوتے ہیں۔ عشاق جن کی راہ معروف معنوں میں ارباب شریعت سے مختلف ہوتی ہے اور وہ یا شاہ حسین اور بلھے شاہ کے پیرو بن جاتے ہیں یا باوا فرید اور سلطان باہو کے اور شاید اسی رجحان کے باعث ہیر میں وارث شاہ نے اہل مدرسہ کی جہاں کہیں

موقعہ ملا ہے خوب خبر لی ہے اور پیران پیر یعنی شاہ عبدالقادر جیلانی کی مدح کے بعد حضرت بابا فرید شکر گنج کی مدح بھی کی ہے۔ مدحیہ اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ وارث شاہ کے نزدیک پیران پیر کی خلوص دل سے مدح کرنی چاہیے اور اگر کوئی منزل فقر تک پہنچنا چاہتا ہے تو اس درگاہ میں حاضری دینے اور بار پانے کے بغیر نہیں پہنچ سکتا ہے بلکہ وہ یہاں تک کہہ جاتا ہے کہ حشر کے دن طالبان پیران پیر ہی ہوں جن کو دائیں ہاتھ میں "گرین کارڈ" دیئے جائیں گے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو مسلمانوں میں ایک مخصوص طبقے کا ہے اور ایک مخصوص طبقے کا نہیں موخرالذکر کو عموماً" وہابی یا غیر مقلد کہا جاتا ہے یوں وارث" شاہ کو ہم مقلدین کی صف میں کھڑا پاتے ہیں جن کے نزدیک بزرگوں کے پاس جانا اور مرحوم بزرگوں کے مزاروں پر جانا کفایت گناہ اور اجابت دعا کا باعث بنتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اولیا کے مقابر پر لوگوں کا روز و شب کا ہجوم بتاتا ہے کہ اکثریت کا یہی عقیدہ ہے اور وارث شاہ کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ اسی طبقے کے لوگ عشق رسول اور عشق خدا کی باتیں کرتے ہیں بلکہ مرشد کے بغیر دوسرے عشقوں کی منازل تک پہنچنا ان کے نزدیک ممکن نہیں ہے۔ جیساکہ حضرت سلطان باہو نے فرمایا ہے ۔ الف اللہ چنبے دی بوٹی، مرشد من وچ لائی۔

اور وارث شاہ بھی کہتے ہے کہ "بناں مرشداں راہ نہ ہتھ آوے" بنا ددھ نہ رجدی کھیر میاں" دوسری ملاں کی زبان سے جو غیر شرع وضع قطع وارث نے ناپسند کرتے ہوئے پیش کی ہے اس میں سر کے ایک خاص طرز کے لمبے بال ہیں جن کو پٹے بھی کہا جاتا ہے اور چھوتے بھی اور جن کی طرف پہلے رانجھے کے حوالے سے اس کی "بھابی" نے بھی اشارہ کیا تھا کہ ---- تن ہال کے چوپڑے پٹے جنھاں، کسے دن کی اوہناں تھوں چا ہونا اے۔" بلاشبہ دیہات میں ایسے نوجوان ہر دور میں بعض متشدد قسم کے اہل مسجد ان کو ناپسندیدگی سے دیکھتے آئے ہیں لیکن وارث کے الفاظ میں سے رانجھے ہی کی طرفداری ٹپکتی ہے اور یہ بھی کہ وہ زندگی

میں ایسے متشدد رویے کا حامی تھا اور نہ پسند کرنے والا۔ پھر وارث نے اس غیر مقلد طبقے کی یہ کہہ کر مزید وضاحت کر دی ہے کہ ان کو اس مسجد کے ملاں کی طرح مونچھیں نہ ترشوانے والے لوگ اچھے نہیں لگتے تھے اور ہم میں سے ہر کوئی جانتا ہے کہ لبوں کے بال کس مذہبی روش کے لوگ منڈواتے ہیں اور منڈوانے پر اصرار کرتے ہیں۔ اسی طرح ٹخنوں سے نیچے تہمد یا شلوار وغیرہ کا ہونا بھی ان کے نزدیک خلاف شرع گنا جاتا ہے اور جب ملا رانجھے کو مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ "جیہڑا فقہ دے علم دا نہیں واقف اونہوں چا سولی اتے چاہڑیئے او" تو وہ گویا سرمد کی طرف اشارہ کرتا معلوم ہوتا ہے جسے اندازاً" نصف صدی پہلے اورنگزیبی دور میں شہید کیا گیا تھا اور اس باہمی بحث تکرار کا حاصل وارث نے یہ نکالا کہ "وارث شاہ خدا دیاں خانیاں نوں، ایہ ملاں ہی چمیرڑے ہیں بلائیں۔"

اسی طرح جگہ جگہ خواجہ خضر کا، پنج پیروں کا اور بودلے پیر ایسے لوگوں کا اور لیلتہ القدر کی اعجاز آگہی کا ذکر کرنا اور یہ عقیدہ کہ یہ لوگ مشکل وقت میں امداد کو آن پہنچتے ہیں عقیدے کے اسی نخل کی شاخیں ہیں جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

ہم کو وارث کے اندر پیر پرستی کے ساتھ ساتھ مظلوم دوستی کی جھلک بھی ملتی ہے ورنہ وہ پیر کی ماں ملکی کے منہ سے یہ نہ نکلواتا کہ "آہ فقر دی بری پے جا میاں" اور "وارث شاہ فقیر نے چپ کیتی اوہدی چپ ای دیگ رِدھا میاں۔"

تقدیر اور تدبیر ایک ایسا معمہ ہے جسے انسان شاید روزازل سے حل کرنے میں لگا ہوا ہے اور ابد تک اپنے ناخنوں کو اس گرہ کے کھولنے میں کچا کرتا جائے گا اور ہر کوئی اپنے اپنے جھکاؤ کے مطابق کسی ایک کے حق میں ووٹ ڈالتا چلا آرہا ہے بلکہ کبھی ایک طرف ڈالتا ہے اور کبھی دوسری طرف لیکن وارث نے ایسی ہر صورت حال میں (اس داستان کے حوالے سے) اپنا ووٹ تقدیر پرستی کو دیا ہے کہ ناکام لوگ سدا سے ایسا ہی کرتے آئے ہیں اور اسی لئے وہ ہیر کی زبان سے یہی نکلواتا ہے کہ "کون ہونی دے مناسیاں۔" اس ہونی کا ایک روپ ہماری وہ

معاشرے کو پسند نہ آنے والی عادتیں ہیں جن کو ہم چاہتے ہوئے بھی بعض اوقات نہیں چھوڑ سکتے اور ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات وغیرہ کے ذریعے شب و روز کے اعلانات کے باوجود سگریٹ پینا نقصان دہ ہے اور ہیروئن جان لیوا ہے، ان کے عادیوں کی تعداد میں اضافہ وارث کے اس بول کی تصدیق کرتا ہے کہ "میرا آکھدی بابلا عملیاں توں نہیں عمل ہٹایا جامیاں۔" اور اسی کا دوسرا روپ وہ ہے جسے یوں جوگی کے کاسہ گدائی کے ٹوٹ جانے کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

جو کوئی جمیا مرے گا سب کوئی، گھڑیا بھجی واہ سب وہن گے وے
ٹھوٹھا نال تقدیر دے بھج گیا، وارث شاہ ہوری تینوں کہن گے وے

یادگار وارث کے مصنف نے وارث شاہ کو عقیدے کے لحاظ سے اہل سنت و الجماعت لکھا ہے جو چاروں یاران رسول کا ایک جیسا احترام کرتے ہیں اور وہ پنج تن کا بھی احترام اتنا ہی کرتے ہیں۔ ضیا صاحب نے یہ بات ان اشعار کی بنیاد پر لکھی تھی۔

پنج تن دے جیڈ نہ بیت کوئی، شان فقر دے نور ظہور جیہا
دردمند نہ فاطمہ جئی کوئی، پتر نہیں عباس سپور جیہا
علی وانگ نہ سخی دلیر کوئی، پہلوان نہ مرد مشہور جیہا
نیکو کار نہ وانگ حسن کوئی، بدکار نہ شمر لنگور جیہا

لیکن یہ اشعار الحاقی ہیں اس لئے محض ان کے حوالے سے وارث شاہ کے بارے میں اہل بیت سے عقیدت رکھنے کی دلیل نہیں دی جا سکتی۔ اگرچہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ مسلمان کے اندر ان پانچوں شخصیتوں کے لئے احترام پایا جاتاہے اور وارث شاہ کے اندر یہ عقیدت تو سید ہونے کے ناتے سے ہی کسی مزید دلیل کی محتاج نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی اہل بیت سے محبت کے سلسلے میں چشتی مسلک والوں کا رویہ چوں کہ ارباب تشیع کے رویے سے مختلف، ہے اور وارث

نے گنج شکر کی مدح لکھ کر اپنے چشتی مسلک سے وابستہ ہونے کا اعتراف و اعلان کیا ہے اس لئے ہم اسے معروف معنوں میں اہل بیت سے وابستہ نہیں کر سکتے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ان اشعار کے اضافہ والی الحاق سے کیا مقصود تھا کہ بیشتر دوسرے الحاقی اشعار اس قدر رواں زبان میں لکھے گئے ہیں اور بر محل کہ وہ وارث کی مقبولیت کا باعث بنے۔

وارث شاہ کی دوسری تصانیف

وارث شاہ سے ہیر کے علاوہ بھی بعض چیزیں منسوب ہیں جیسے سی حرفی' دوہڑے' معراج نامہ' عبرت نامہ' سسی پنوں' ترجمہ قصیدہ بردہ اور چوہڑیٹ نامہ۔ ان میں سے آخر الذکر کے بارے میں سیف الملوک کے خالق میاں محمد بخش کے تاثرات ہیں کہ۔

جیہڑی اوس چوہڑیٹ آکھی ' سمجھے جے کوئی ساری
اک اک سخن اندر خوش ہوئی' وانگ پھلاں دی کھاری

اور مصنف کے متعلق میاں صاحب کا یہ کہنا کہ۔

وارث شاہ سخن دا وارث نندے کون اوہناں نوں
حرف اوہدے تے انگلی دھرنی ناہیں قدر اسانوں

غیر مبہم طور پر اشارہ کرتا ہے کہ میاں صاحب وارث شاہ ہی کو چوہڑیٹ نامہ کا خالق سمجھتے تھے۔ ادھر چند سال پہلے جب پنجابی شعرو ادب کے بارے میں کھوج زیادہ ذوق و شوق اور محنت سے شروع ہوا تو وارث شاہ کے ساتھ اس سے منسوب دوسری تحقیقات بھی مرکز توجہ بنیں۔ چنانچہ سید سبط الحسن ضیغم صاحب نے آج سے تقریباً" چودہ برس پہلے چوہڑیٹ کو بھی موضوع تحقیق بناتے ہوئے لکھاتھا کہ انہوں نے کھوج[1] کریدتے ہوئے بلاغ القران کے ایڈیٹر ایم محمد علی رسول نگری کو ایک خط لکھا تھا جس کے جواب میں موصوف یوں گویا ہوئے تھے کہ رسول نگری ایک کنواں ہے۔ جسے میاں وارث کا کنواں کہا جاتا ہے (یاد رہے کہ یہ وارث رسول نگری کا ذکر ہے۔ش) ۔ ان کی شاعری کے متعلق میں اتنا ہی جانتا

۱۔ کھوج درپن ۔امرتسر ۱۹۷۹ء

ہوں کہ میری دادی صاحبہ ایک ہاتھ لکھی کتاب پڑھا کرتی تھیں جس کا نام چوہڑی تھا اور اس کا آخری شعر یہ تھا۔ ؎

کی چوہڑے کی ذات اساڈی' آکڑ چاوڑ کیہا
گوہیا تھپن' کوڑا سٹن' کار اساڈی ایہا
میں چوہڑیٹی آں -- -- --

لیکن مولوی محمد شاہ نوشاہی نے تحقیق طلب بات کو یوں آگے چلایا ہے کہ میاں وارث ذات کے تارڑ جٹ تھے اور تحصیل وزیر آباد کے گاؤں رسول نگر کے رہنے والے تھے لیکن موضع پیری والا تحصیل حافظ آباد کے ایک مصلی درویش کے مرید بن گئے تو برادری کے لوگوں نے آوازے کسنے شروع کر دئے۔ یہ چوہڑیٹی ان طعنوں کا جواب تھا اور چونکہ (ضیغم صاحب کی تحقیق کے مطابق) میاں محمد کا اس علاقے میں آنا جانا رہتا تھا بلکہ بقول بعض میاں صاحب نے سیف الملوک کا کچھ حصہ میاں جان محمد کی قبر پر بیٹھ کی موزوں کیا تھا جو رسول نگر سے مشرق کی جانب ایک قریبی گاؤں میں مدفون ہیں۔ کیا ضیغم صاحب کے خیال میں میاں محمد کے مذکور بالا شعر میں " وارث شاہ سخن دا وارث" سے مراد وارث رسول نگری ہے؟ جس سے اختلاف کی گنجائش ہے کہ کسی قرینے سے بھی میاں صاحب وارث رسول نگری کو سخن کا وارث نہیں کہ سکتے تھے اور انہوں نے اسے (جنڈیالوی) وارث ہی کی تخلیق جانا ہو گا کہ اٹھارہویں صدی تک بالخصوص پنجابی شعر و ادب کے حوالے سے تصنیف ہی زیادہ مورد توجہ رہی اور مصنف کے حالات کی طرف کم ہی دی جاتی تھی اور مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میاں محمد نے تیس سال کے اردگرد کی عمر میں کب اور کیوں رسول نگر کی طرف جانا شروع کیا لیکن اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو وہ ضرور وضاحت کرتے کہ وارث شاہ سے مراد وارث رسول نگری ہے ضیغم

صاحب کے اپنے کہنے کے مطابق وارث رسول نگری نے اپنے آپ کو کہیں بھی سید وارث یا وارث شاہ نہیں لکھا تو میاں صاحب کے اس شعر میں بھی چوہڑیٹی کے مصنف جنڈیالوی وارث ہی بنتے ہیں یہ الگ بات کہ جدید تحقیق کو وارث رسول نگری کی متاع قرار دے دے۔

لیکن اگر چوہڑیٹی وارث رسول نگری (یا کسی اور وارث) نکل آئے تو پھر باقی تخلیقات بھی متاثر ہوتی ہیں کہ مزاج اور زبان کے انداز سے وہ چوہڑیٹی کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہیں (ماسوا ترجمہ قصیدہ بردہ اور سی کے) اور عبرتنامہ' معراج نامہ دوہڑے کسی ایسے وارث کے لگتے ہیں جو بلھے شاہ سے متاثر ہے یا کہ عبرت نامہ کے اس مصرع سے گماں گزرتا ہے -- نے جاگ گھراڑے مارنیں" کہ اس وارث نے بلھے شاہ کا یہ بول "اٹھ جاگ گھراڑے مار ناہیں" سنا ہوگا اور ہیر میں چونکہ قصور میں رہنے کے باوجود بلھے شاہی رنگ کی جھلک نہیں ملتی اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ عبرت نامہ کسی اور وارث کا ہوگا جس نے ساری نظم میں کہیں بھی اپنے آپ کو وارث شاہ نہیں کہا نرا وارث ہی لکھا ہے اور اسی سے ضیغم صاحب نے ایک امتیازی راہ نکالی ہے کہ جن منظومات میں وارث شاہ آیا ہے وہ جنڈیالوی وارث کی ہیں اور باقی وارث رسول نگری کی (یا کسی اور وارث کی --- ش) چنانچہ اسی اصول کو میزان بنا کر ضیغم صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ---

عبرت نامہ وارث شاہ کی تخلیق ہے
باراں ماہ بھی وارث شاہ کی تخلیق ہے

معراج نامہ اور نصیحت نامہ وارث شاہ کی تخلیقات نہیں ہیں۔

لیکن جب ہم اس اصول کو سامنے رکھ کر ہیر کی جانب نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شیخ عبدالعزیز کے مرتب کرہ نسخہ کے مطابق چالیس کے

قریب مقطع ایسے ہیں جن میں وارث شاہ کی جگہ وارث ہوتا گیا ہے مثلاً" تکمیل داستان والے بند کا مقطع ہے ---" وارث جنھاں نے آکھیا پاک کلمہ' بیڑی تنھاں دی عاقبت پار" اور اسی طرح چند اور یہاں درج کیے جاتے ہیں ---

وارث بارہوں سو نہیں' سیاہ اندر' تینو ہون جویں مالزادیاں دے
وارث بندگی واسطے گھلیا سی' آ جئیا پہن کھاونے نوں
وارث نوں رب تو چھڈ کے پیا چھیٹ ایویں رائیگاں عمر گوایو سو
وارث کڈھ قرآن تے بہیں سیر' کیہا اڈیو مکردیاں پھاہیاں نوں
افلاطون دی ریش معتراض کیتی' وارث قدرتاں چیکھ کے واریائی
وارث یار دے خرچ تحصیل وچوں' حصہ صرف قصور دا کٹیو نیں
وارث وانگ کشتی پریشان ساں میں' پانی پہنچیا نوح دیاں پیچیاں نوں

یوں یہ اصول پن چھان میں "دھرم کانٹا" نہیں بنتا کیونکہ دوہڑوں میں بعض جگہ (ہیر کی طرح) وارث آیا اور بعض جگہ وارث شاہ جیساکہ ایک دوہڑے کا قطع ہے۔ "وارث رانجھا چاک تسانوں سانوں یوسف ثانی" جب کہ ایک دوہڑا یوں ہے ۔

بانہوں پکڑ بہالی ساں میں سرور عالم کھارے
چارے یار کھلوتے پھڑ کے سالورے لڑ چارے
دئیں چٹھی سرحوراں پائی' سے سے تکن وچارے
وارث شاہ تد عقد بدھونیں میرا رانجھن نال پیارے

اور وجہ یہ ہے کہ شاعر کو موقع محل کے مطابق کبھی وارث اور کبھی وارث شاہ باندھنے کی آزادی تھی۔

اب ہم سی حرفی کی طرف آتے ہیں جسے سی حرفی "سسی پنوں بھی کہا گیا ہے اور محض سسی بھی اس کا ذکر باوا بدھ سنگھ نے پریم کہانی میں نہیں کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے طبع ہوتے وقت باوا جی نے اس کا نام نہیں سنا تھا۔ اور شاید اسے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوان ہی نے معروف کروایا۔ وہ لکھتے ہیں "اس وقت میرے سامنے سسی وارث شاہ (خورد) کے دوہڑے موجود ہیں۔ ان دوہڑوں کو مولوی عبدالقادر اول مدرس مدرسہ تعلیم القرآن انار کلی لاہور نے مفید عام پریس میں طبع کروایا تھا۔ جس کے آخر میں مولوی صاحب رقم طراز ہیں کہ

یہ نسخہ میرے بزرگوں کے پاس ۱۲۲۱ھ میں تھا جسے میں نے اب چھپوایا ہے -----

مادری زبان کی قدر کرنے والے اور سید وارث شاہ مرحوم کے جادو بھرے شعروں کے عاشق یہ جان کر خوش ہوں گے کہ میرے پاس شاہ صاحب کی مکمل سسی کا قلمی نسخہ بھی ہے جو ابھی تک طباعت آشنا نہیں ہوا۔ میں اپنے جدی کتب خانے میں سے اس کا کچھ حصہ لے کر شائع کر رہا ہوں۔ سو سال سے یہ نسخہ ہمارے خاندان میں چلا آرہا ہے۔ (آخر میں اپنا پتہ یوں دیا ہے) حکیم عبدالقادر پسروری، حویلی کابلی مل، متصل جنج گھر ہنوداں، لاہور۔

دیوانہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی سسی خورد مطبوعہ میں سی حرفی دوہے جس کے مواد کو تاریخ کے ساتھ اچھی طرح ملانے کے بعد دیوانہ صاحب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب احمد شاہ نے لاہور کے حاکم شاہ نواز پر حملہ کرکے اسے بھگا دیا تھا ان ایام میں وارث شاہ لاہور میں تھا جلد ہی آگیا تھا۔ دیوانہ صاحب نے اس حملہ کی تاریخ ۱۷۴۷ء دی دے اور اندازہ لگایا ہے کہ اس وقت وارث بیس برس کی عمر کا اندازا" ہوگا۔ سی حرفی دوم میں تاریخی حوالے کے بعض مصرعے بھی انہوں نے دیئے ہیں۔ جیسے ؎

- ج جس دن شہر لاہور اتے پیا شور جاں چور ایہہ ڈھکے آہے
- ح حاکم شہر لاہور والے سنجیں چھڈ کے گئے حویلیاں نوں
- رب کرے چوغطے دی بادشاہی شیشہ قہر پٹھاناں دا چور ہووے
- ر رناں چنگیریاں اوہناں نالوں جھیڑے شاہ نواز دے سنگ آئے
- گھر گھر بارکاں شادیاں نیں چنگا چڑھیا ای چن چو غطیاں دا
وارث شاہ قنداری کھڈار ناہیں اکھیں ویکھ بازی ہن ہار دا اے
- الف الٰہی توں اپنا فضل کریں بادشاہ محمد شاہ ہووے
تب لگ چوغطیاں دا راج ہووے جب لگ تائیں مہر و ماہ ہووے
جیہڑا راضی نہ ہوئے چوغطیاں تے نیلے پیرتے مکھ سیاہ ہووے
وارث شاہ مبارک شاہ کہو شالا ایہو سلامت شاہ ہووے
- ی یارب توں مہربان ہویوں تدے پھر چوغطیاں دا راج ہویا
توئیں دتی شکست قندھاریاں نوں دلی والیاں دے سرتاج ہویا

لیکن ان مصرعوں کے تاریخی پس منظر کی انہوں نے کوئی بات نہیں کی بس جیسا کہ ان کا مزاج تھا وہ بات میں بات نکالتے گئے اور یہ بتانا بھول گئے کہ ان اشعار سے کیسے اندازہ ہوتا ہے کہ وارث شاہ ان ایام میں لاہور میں تھا کہ یہ باتیں تو ان دنوں ادھر ادھر بھی اڑتی پھرتی تھیں۔ یہاں ایک غلطی کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو ضیغم صاحب کے کھوج درپن (جنوری ۱۹۷۹) والے ان کے مضموں میں کمپوزنگ کرتے ہوئے گھس آئی تھی (میرے خیال میں)۔ ضیغم صاحب نے جو حوالہ دیا ہے اس میں آخری فقرہ یوں لکھا گیا ہے کہ اس توں تھوڑے ای مہینے بعد وارث شاہ نے ایہہ سی حرفی قصور وچ بہہ کے لکھی" کیونکہ میرے والے دیوانہ جی کے نسخے میں قصور کی جگہ لاہور لکھا ہوا ہے اور یہی دیوانہ صاحب کا

مقصود بھی تھا۔ ضیغم صاحب نے آگے لکھا ہے کہ احمد شاہ نے دو محرم ۱۱۶۱ھ کو لاہور پر حملہ کیا تھا جو ۱۷۴۸ عیسوی سال بنتا ہے لیکن جا کے (تحصیل ۵ سکہ، ضلع سیالکوٹ) پر اس نے قبضہ اپنے آٹھویں حملے میں کیا تھا (بمطابق دسمبر ۱۷۶۶) اس لیے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ وارث شاہ نے یہ سی حرفی شروع تو قصور ہی میں ہوگی لیکن انہوں نے نظر ثانی وغیرہ کے بعد اسے ۱۷۶۶ میں مکمل کیا ہوگا۔

یہاں لاہور اور قصور کے جھگڑے میں نہ پڑتے ہوئے بھی ایک دشواری پیدا ہو جاتی ہے کہ ابدالی کے آٹھویں حملے کا سال وہی بنتا ہے جس میں وارث شاہ کے اپنے بیان کے مطابق (کہ ۱۷۶۶ء کو ۱۱۸۰ ہجری سے منطبق کیا گیا ہے) وارث ملکہ ہانس میں بیٹھا ہوا اپنی تصنیف کو مکمل کر رہا تھا۔ سن یاراں سے اسیاں نبی ہجرت لمیں دیس دے وچ تیار ہوئی اور اس قلمی مصروفیت کے دوران اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ لاہور یا قصور میں جا کر تیغ و سناں پکڑ لیتا۔ اس طرح اس سی حرفی کے بعض مصرعوں کی بنیاد پر نکالا گیا نتیجہ نظر ثانی کا محتاج ہے اور ایک بار پھر اس کے لیے گنجایش پیدا کر جاتا ہے کہ ہم کسی اور وارث کا بھی وجود تسلیم کر لیں جسے اس سی حرفی کے حوالے سے چوغطوں سے بہت زیادہ عقیدت تھی اور جو کسی نامعلوم وجہ سے ان کے لیے (برا) دعا تھا حالانکہ اس دور کے لکھنے والے حملہ آوروں اور سکھوں کی دراز دستیوں کے تو شاکی ملتے ہیں لیکن "چوغطہ شاہی" جس قسم کی تھی اس سے آگاہی رکھنے والے کسی لب سے ان کے لیے کوئی حرف دعا نہیں نکلا اور یہ مزاج ہیر کے خالق وارث شاہ کا نہیں ہو سکتا تھا۔

ویسے دل گواہی نہیں دیتا کہ وارث شاہ نے ہیر کے علاوہ اور کچھ نہ موزوں کیا ہو۔ کیونکہ شعر و سخن کی پوری دنیا میں کوئی بھی ایسا شاعر نہیں ملتا جس نے ایک طویل مثنوی تو لکھی ہو لیکن کوئی مختصری چیز نہ لکھی ہو اور یہ ایک بات ایک

بار پھر عنان فکر کو ادھر موڑتی ہے کہ اس سے منسوب دوسری چیزوں میں سے بعض کو ضرور اسی کی تخلیقات تسلیم کیا جائے۔ ہر شاعر پر وقتی کیفیات بھی آتی ہیں جن کے زیر اثر وہ چند شعر موزوں کرتا ہے اور پھر اس کے سامنے تو کلاسیکی شاعری کا باغ کھلا ہوا تھا اور چار چار مصرعوں میں کسی ایک قلبی واردات کا اظہار بھی عام تھا جس نے اس کا دامن کھینچا ہو گا لیکن قیاس ہے کہ وہ سارا سرمایہ ملکہ ہانس کے ایام کے بعد زمانے کے دست برد سے بچ نہ سکا ہو گا اور ممکن ہے وہ اس سی حرفی کے سے روپ میں ہی ہو جس میں حالات حاضرہ کے حوالے سے اب اس نے غبار نکالا ہو لیکن فضا مختلف انداز میں غبار آلود ہو کر اس کے اظہار کے لیے موزوں نہ رہی ہو اور جلد بعد ہی یعنی رنجیتی دور میں پنجاب کا ماحول تو ضرور سنبھل گیا لیکن اس ماحول میں وہ اشعار تو زبان پر نہیں لائے جا سکتے تھے اور یوں ممکن ہے وہ تلف کر دیئے گئے ہوں یا ہو گئے ہوں، بالکل اسی طرح جیسے مولوی غلام رسول قلعہ مہمان سنگھ والے کے وہ اشعار جو فرنگیوں کے خلاف لکھے گئے تھے کہ اب انگریزی تسلط ہر طرف تھا۔

جاٹوں کے حوالے سے وارث کی گستاخ گوئی کی مجھے ہیر میں سے ایک سے زیادہ وجوہات ملی ہیں یا یوں کہیے کہیں سے "ٹوگیری" کی ہے۔ اول تو یہ کہ داستان میں جگہ جگہ جاٹوں کے خلاف لب کشا ہونے ولا شاعر ممکن نہ تھا کہ فوری افتادوں کے وقت لب دوختہ رہتا۔ دوسرے اس نے ڈوگروں کے سلسلے میں بھی دل کا بخار کم از کم ایک بار تو ضرور یہ کہہ کر نکال لیا کہ --- ڈوگر لٹ ایمان نوں ذبح کھاندے دھیاں ماردے تے پار لاوندے جے" اور میرے خیال میں یہاں فوری وجہ یہ بنی کہ محمد حیات کے آخری ایام میں ڈوگرے اس علاقے میں گھس آئے تھے اور چونیاں سے ممدوٹ تک چھا گئے تھے اور ہانس کا سربراہ ان کے آگے بے

بس تھا اور وہ من مانی کرتے ہوں گے جسے وارث جیسا حساس شاعر پسند نہیں کر سکتا تھا۔ معروف معنوں میں یہ لوگ بھی جاٹ ہی تھے۔ یہ بنیادی طور پر غیر دو آبی تھے اور بالائی پہاڑی علاقوں کے رہنے والے۔ تیسرا باعث یہ بھی ہو گا کہ بابا نانک کی وفات کے بعد نانک پنتھیوں کے دو فرقے بن گئے تھے۔ جن میں سے ایک کو ہم رہبانیت پسند کہہ سکتے ہیں یہ لوگ دنیا دوستی سے دور اور نفور تھے اور "اداسی" کہلاتے تھے یعنی تیاگی تھے اور اسی لیے گوروؤں کے اس سلسلے سے ان کی راہ جدا رہی جو گدی بنا کر بیٹھ گئے اور وارث کے دور میں گمان گزرتا ہے کہ اداسئیے اور درویش تقریباً" (مذہبی اصل کے علاوہ) ایک سے ہی گنے جاتے تھے اور بلا تفریق مذہب احترام سے دیکھے جاتے تھے اور اسی لیے وارث شاہ نے یہ کہنے میں باک محسوس نہ کیا۔۔۔۔۔۔"دنیا چھڈ اداسیاں مل لیناں۔۔۔۔سید وارث توں ہن وارث شاہ ہویا" لیکن اس کا میرے خیال میں مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ تیاگی درویش ہو گیا تھا صرف اسی قدر ہے کہ وہ حادثات و واقعات کے بے رحم تلوار سے زخم زخم ہو کر دنیا سے دل برداشتگی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے آس پاس نسلی اور نسبی تفاخر و تکبر کی بساطوں کو بچھتے اور سمٹتے دیکھ کہ وہ جیسے ترک نسب کے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جس میں فلاں ابن فلاں کا سکہ کھوٹا ہوتا جارہا تھا اور اس نے اعتراف و اعلان کیا کہ اب میں سید وارث شاہ نہیں ہوں وارث شاہ ہو گیا ہوں۔ ان دونوں ترکیبوں میں ایک نازک سا فرق ہے۔ سید وارث سے ایک ایسا شخص مراد ہے جس میں نسبی برتری کا احساس موجود ہے اور اپنے سید ہونے پر ناز کرتا ہے۔ جبکہ وارث شاہ ہو جانا اس احساس کی نفی کرتا ہے کیونکہ وہاں سید کا لفظ نسبی حوالہ رکھتا ہے اور ہر کسی کو (پنجاب میں) سید نہیں کہا جا سکتا تھا وہاں شاہ کا لفظ ہر تارک الدنیا کے لیے احتراماً" بولا برتا جاتا تھا۔ چنانچہ تنویر بخاری صاحب نے پنج دریا

(وارث نمبر) میں جنڈیالہ کا تعارف کرواتے ہوئے پیر حیات شاہ کا ذکر کیا ہے جو قوم کے جاٹ تھے اور مشکی شاہ کا بھی جو ذات کے مراثی تھے اور عنایت شاہ قادری (بلھے شاہ کے مرشد) تو سب جانتے ہیں کہ نسباً" سید نہیں تھے۔

ہیر وارث شاہ میں مذکور بعض مقامات

ہیر رانجھا کی داستان جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے وارث شاہ کی طبع زاد نہیں ہے۔ اسی طرح بعض مقامات بھی اسے ماضی کے داستان طرازوں سے گویا ورثے میں ملے لیکن وارث شاہ کی اس تصنیف کے بعد وہ ساری داستانیں بالکل دب کر رہ گئی ہیں اور گزشتہ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے جہاں کہیں بھی ہیر کے چار بول بولے گئے وارث شاہ والی ہیر کے ہی بولے گئے ہیں۔ اسی لیے بیشتر پڑھنے ۔ سننے والوں نے ان مقامات کو بھی وارث شاہ ہی کی ایجاد طبع سمجھا ہے جن کا اس داستان میں ذکر آیا ہے اور کئی بار یہ استفسار بھی کیا گیا ہے کہ کیا رانجھا واقعی تخت ہزارہ کا رہنے والا تھا؟ ہیر جھنگ کی رہنے والی تھی؟ اور اس کا شوہر رنگپور کا رہنے والا تھااور اگر یہ قصہ تاریخی حقیقت نہیں ہے تو آخر کیوں ان مقامات ہی اور رانجھوں سیالوں اور کھیڑوں ہی کو داستان کے تانے بانے میں برتا گیا۔ اس کا بظاہر کوئی جواب بھی نہیں ملتا بجز اس کے کہ ہم اسے داستان کی ایک تخلیقی مجبوری سمجھیں کہ اسے کسی نہ کسی جگہ سے شروع ہونا ہوتا ہے اور عموماً دو جگہوں سے۔ ایک وہ جگہ جہاں سے ہیرو جنم لیتا ہے ایک وہ جہاں سے ہیروئن جنم لیتی ہے اور ایک تیسری جگہ بھی بیچ میں آجاتی ہے جہاں سے کوئی رخنہ انداز جنم لیتا ہے۔ چنانچہ اس داستان میں بھی بات کو دھیدو رانجھے سے شروع کیا گیا ہے اور اسے کسی نہ کسی جگہ کا باسی ظاہر کرنے کے لیے تخت ہزارے کا بتایا گیا جہاں دھیدو کا باپ بالفاظ وارث ۔

موجو چوہدری پنڈ دی پاہندھ والا چنگا بھائیاں دا سردار آہیا
بھلی بھائیاں وچ پریت اس دی منیا چوترے تے سرکار آہیا

میں صورت ہیر کے وطن جھنگ سیال کی اور سیدا کھیڑے کے وطن رنگپور کی ہے۔ اس میں دشواری جھنگ کے اندر ہیر کے مقبرے سے پیدا ہوتی ہے جسے اگر وہی داستانی ہیر سمجھا جائے تو ہیر دھیدو کو بھی اور سیدا کھیڑے کو بھی تاریخی شخصیتیں ماننا پڑتا ہے۔ ادھر اس داستان کا انجام مختلف لکھنے والوں نے جس طرح مختلف بیان کیا ہے اس سے خیال اس طرف جھکنے لگتا ہے کہ جھنگ میں مقبرے والی ہیر کوئی اور شخصیت تھی جسے "تذکرہ اولیائے جھنگ" میں ایک عارفہ کاملہ بتایا گیا ہے۔

لیکن ہم ماضی کے دھندلکوں میں سے حقائق کو جھانکنے کی جگہ ان مقامات کی طرف آتے ہیں جو بہرحال داستان کا حصہ بن چکے ہیں اور جس طرح وارث شاہ نے آغاز کیا ہے ہم بھی تخت ہزارے ہی سے آغاز کرتے ہیں۔

"تخت ہزارہ" دریائے چناب کے کنارے کی ایک بستی ہے جس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب بسی اور کس نے بسائی لیکن تخت کسی جگہ کے حوالے سے جب بھی اور جہاں بھی آیا ہے اس سے چونکہ کوئی ایسی جگہ ہی بعض کے خیال میں مراد لی گئی ہے جو آس پاس کی بستیوں سے قدرے اونچی سطح پر ہو اس لیے نام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بستی بلند جگہ پر آباد تھی اور موجودہ ہزارہ کے پاس ہی "بہ ہزارہ" کی موجودگی بتاتی ہے کہ دمودر والا ہزارہ جس نے سب سے پہلے پنجابی میں اسے رانجھے کا مولد بتایا وہی بہ ہزارہ تھا اور دریا کے کنارے اس کا ہونا خود بخود اس کے اہم ہونے کا ثبوت بن جاتا ہے کہ پنجاب کے تمام دریامیں شمال مغرب کی جانب سے آنے والے حملہ آوروں اور کاروانوں کا اپنی آس پاس کی میدانی زمین کے حوالے سے شگفتگی کے ساتھ استقبال کرتا تھا اور پنجاب کی بیشتر عشقیہ داستانوں کا مرکز اپنے اسی جغرافیائی ماحول کے باعث بنا کہ ایام

قدیم میں جغرافیائی صورت حال ہی ثقافتی حالات کو تشکیل دیتی رہی اور ایک خوش ذوق کا یہ جملہ قابل توجہ ہے کہ پنجاب کا ایک ہی کلچر ہے اور اسے ایگری کلچر کہتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ چونکہ ماضی بعید میں داستانیں بڑے لوگوں اور بڑی جگہوں میں سے آغاز کرنے کی روایت چلی آرہی تھی اس لیے دمودر نے بھی تخت ہزارے ہی کے ایک فرد کو ہیرو کے طور پر انتخاب کیا کیوں کہ اس آبادی کے لوگ تجارتی اور غیر تجارتی مشاغل کے حوالے سے جنوب کی جانب کشتیوں پر جاتے ہوں گے اور جھنگ کے لوگوں کے لیے اجنبی نہیں ہوں گے اور میل جول کے مواقعوں میں سے کسی رانجھے کا کسی ہیر کے ساتھ تعلق خاطر پیدا ہوجانا ناممکن نہیں تھا۔

لیکن دریا کے کنارے کی آبادیوں کو اس کی تلون مزاجی سے ہمیشہ واسطہ پڑتا آیا ہے اور انہیں اس کا احترام ہی کرنا پڑتا تھا جس کی خودسری کئی بار ان کو بے گھر بناجاتی یا ایک سمت سے دوسرے سمت چل دیتی اور یہ ہزارہ کے کھنڈرات زبان حال سے اپنی سرگزشت سناتے چلے آئے ہیں۔ پختہ اینٹیں ایام قدیم میں ہر بستی کا نصیبہ نہیں ہوتی تھیں اور معاشرتی ہی نہیں معاشی فوقیت کا پتہ دیتی تھیں زرعی طرز زیست کے بطن سے پیدا ہونے والی خوش حالی کی فضا ہی میں اس آبادی کے نوجوان اس ٹھاٹھ سے رہتے ہوں گے جس کی طرف وارث شاہ نے یوں اشارہ کیا ہے

اک تخت ہزاریوں گل کیجے جتھے رانجھیاں رنگ مچایا اے
چھیل گھبرو مست ار یلڑے نیں سندر اک تھیں اگ سوایا اے
والے "کوکھلے" مندر تے مجھ لنگی نواں ٹھاٹھ تے ٹھاٹھ چڑھایا اے

اور ہمارے لیے تخت ہزارے کی اہمیت اس میں نہیں ہے کہ وہ اس داستان

کے ہیرو کی زادگاہ تھی بلکہ اس میں ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں آج سے چند صدی پہلے کی وہ معاشرتی اور معاشی جھلک ملتی ہے جسے صنعتی سیلاب بہا کر لے گیا ہے اور اب ہم ایک معاشرتی "ٹبہ ہزارہ" کے پڑوس میں بیٹھے ہوئے اس ماضی کو یاد کرتے ہیں جس کی بنیاد افراد کے تانے بانے کی طرح باہم بنے ہونے میں تھی، آج کی طرح ادھڑ ادھڑ کر تار تار ہوتے جانے میں نہیں تھی۔ تخت ہزارہ ایک ایسی بستی تھی اور موجودہ تخت ہزارے سے مشرق کی جانب چند کوس کے فاصلہ پر یعنی ہیر رانجھا کی داستان میں جس ہزارے کا ذکر ہے وہ موجودہ ہزارہ نہیں ہے بلکہ وہ ٹبہ ہزارہ تھا دریائے چناب جس کے مشرق کی جانب بہتا ہوا گزرتا تھا اور جھنگ سے دو منزل فاصلہ کی دوری پر جس کے باعث اسے ایک رات راستہ کے ایک گاؤں میں گزارنی پڑی تھی۔

(ب) جھنگ — تخت ہزارے کی طرح جھنگ بھی دریائے چناب ہی کی ایک ساحلی بستی تھی اب بھی ہے یہ چونکہ جہلم اور چناب کے سنگم سے اوپر کی جانب بیس پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اس لیے اس کی اہمیت ہزارہ سے زیادہ رہی ہوگی، اس طرح معاشرتی اور معاشی ہی نہیں سیاسی لحاظ سے بھی تخت ہزارہ پر اسے فوقیت رہی ہوگی جس کا اندازہ اس سے بھی ہو جاتا ہے کہ جب ہیر رانجھے کی باہم دلچسپی ایک راز نہیں رہتی اور بعض اسے مناسب خیال کرتے ہیں کہ دونوں کو قید شرعی میں دے دیں تو رانجھوں کو ہم پلہ نہ سمجھ کر اس خیال کو ٹال دیا جاتا ہے۔ اس جگہ کو یوں تو سیالوں کے حوالے سے جھنگ سیال بھی کہا جاتا رہا ہے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سیالوں کے یہاں آباد ہونے اور صاحب اختیار ہونے سے بہت پہلے کی بستی ہے جسے چینی سیاح ہیون سانگ نے ساتویں صدی عیسوی میں جہانگ لکھا ہے جو دیکھا جائے تو جھنگ ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے اور

یونانیوں کا جھانگ بھی ہمارے خیال میں یہی ہے اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ہر چند ہلال زبیری صاحب کو اعتراض ہے کہ یہ نام جھنگی سے بنا ہوا نہیں ہے لیکن گرم ممالک گرم ممالک میں ایام قدیم میں لوگوں کے بسیرے جھنگیاں ہی ہوا کرتی تھیں اور جسے ہم جھنگی کہتے ہیں وہ جھنگی ہی کی ایک صورت ہے کہ نون غنہ کھسک جانے اور گھس آنے کی عادت ہے لیکن تخت ہزارے کی طرح یہاں بھی بستی کا نام اہم نہیں ہے۔ اہم اس لیے بھی وہ معاشرتی اور معاشی حالات ہی ہیں جنہوں نے اس کو کسی داستان کی ہیروئن کا وطن کا شرف بخشا اور بظاہر وہ یہی تھے کہ تجارتی حوالے سے دریائے چناب ہی موجودہ باقی دریاؤں سے زیادہ موزوں چلا آیا ہے اور اس کا مثبت اثر اس کے ساحل پر بسنے والوں کے حالات پر پڑتا رہا ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس کے پانی میں عشق رچا بسا ہوا ہے تو اس کا مطلب بھی سوچیں تو یہی ہے کہ اس کے کنارے بسنے والے لوگ آسودہ حال رہے ہیں، یہی آسودگی آہستہ آہستہ لوگوں کو اور بالخصوص عورتوں کو خوبصورت بناتی جاتی ہے اور آس پاس ہی نہیں دور دور تک ان کے حسن کا شہرہ ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ جھنگ کی عورتوں کی رعنائی کی باتیں تخت ہزارے تک پہنچ چکی تھیں کہ جھنگ میں جو سہولتیں اور آسودگیاں چوچک کے خاندان کو اور بالخصوص اس کی اکلوتی بیٹی کو حاصل تھیں اس نے اس کی حیثیت ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی سی بنادی تھی۔ ویسے یہاں بھی جب وارث شاہ نے اس کے حسن و جمال کی تعریف اپنے لافانی اشعار میں کی ہے تو ساتھ ہی اس رہن سہن کی طرف بھی درپردہ اشارہ کردیا گیا ہے جس میں کھاتے پیتے گھروں کی بے فکر لڑکیاں اپنے شب و روز کیوں کر گزارتی تھیں اور ان کے جلال کے آگے کسی کیدو کی نہیں چلتی تھی۔

(ج) رنگپور ـــــ یہ جگہ بھی لب آب لیکن جہلم اور چناب کے سنگم سے

قدرے آگے واقع ہے اور کھیڑا قوم کے لوگوں کے باعث اسے رنگپور کھیڑاں کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا کاغذات مال میں نام چبوترا درج ہے اور شاید اس بنا پر کہ بستی بلندی پر آباد ہے اور دریا کے کنارے کی بعض بستیاں سیلاب کی زد سے محفوظ رکھنے کے لیے اونچی جگہوں پر بسائی جاتی تھیں یا بار بار سیلاب کے ہاتھوں گر گر اونچی ہوتی جاتی تھیں کہ لوگ پہلے ملبے ہی پر دوبارہ دیواریں کھڑی کر لیا کرتے تھے۔ اندازاً" یہ جھنگ اور ملتان کے درمیاں واقع ہے اور قیاس ہے کہ کشتیوں کے ذریعے تجارت کے ایام میں جسے بے رواج ہوئے ایک صدی ہی گزر پائی ہے وہ ملاحوں کی عارضی منزل بن گیا ہوگا اور تجارتی گڑھ بھی جہاں جہلم کے ذریعے بھی تاجر آتے ہوں گے اور چناب کے ذریعے بھی۔ یعنی مشرقی مغربی اور شمالی جانب سے اور داستان میں اس لیے کھیڑوں کے تمول کی طرف اشارے ملتے ہیں اور جھنگ کی شہزادی کے لیے کسی ایسی ہی جگہ کا کوئی گھر موزوں ہو سکتا تھا اور اس داستان کا حصہ بن سکتا تھا۔

(د) **کوٹ قبولہ** جیسا کہ نام میں بھی حوالہ موجود ہے یہ کوٹ قبول خاں نے بنوایا تھا جو غیاث الدین تغلق کا معتمد تھا اور داستان کے مطابق ہیر اور رانجھا رنگپور سے جب بھاگ نکلے تو انہوں نے اسی جانب رخ کیا تھا اور یہاں ہی کے راجے عدلی کے آگے معاملہ پیش ہوا جس نے شرعی حوالے کے باعث مقدمہ قاضی کے سپرد کیا اور قاضی نے شرعی تقاضے پورے کرنے کے بعد جب ہیر کھیڑوں کو دے دی تو اس نے مظلومیت بھری ایسی آہ بھری کہ اس سے شہر کو آگ لگ گئی۔

یہاں بھی اصل اہمیت اس میں آگ لگ جانے کی نہیں بلکہ اس کی ہے کہ کوٹ قبولے کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ اس وقت اگر ایک طرف کوئی راجہ عدل فریاد رس ہوتا تھا اور ظالم کو گرفتار کر کے لے آنے کا حکم دے دیتا تھا تو

دوسری جانب قاضی اس وقت تک گرفتار شدگان میں سے کسی کو ظالم یا مظلوم نہیں گردانا جاتا تھا جب تک عدالتی تقاضے نہ پورے کر لیے جاتے اور شہر کا نذر آتش ہو جانا جس قسم کا واقعہ گنا جائے یہ ایک حقیقت بنتی ہے کہ قاضی شہر نے وہ سب تقاضے پورے کرنے کے بعد اپنا فیصلہ دیا اور شاعر یا قاری جو بھی محسوس کریں عدالتی حوالے سے ہیر اور رانجھے کا اقدام کسی طرح بھی کوئی جواز نہیں رکھتا تھا کہ اس طرح معاشرے میں فتنے کا وہ دروازہ کھل جاتا جو کبھی بند نہ ہوتا۔

(ہ) ٹلہ بالناتھ ٹلہ بظاہر ٹیلہ ہی کی ایک صورت ہے اور کم اونچی پہاڑی کو کہا جاتا ہے اور دنیا کے دھندوں کو ترک کرنے والے خدا یاد لوگ بعض ایسی جگہوں کو اپنا ٹھکانا بنا لیا کرتے تھے۔ ٹلہ بالناتھ بھی جہلم کے قریب ایک ایسی ہی جگہ ہے۔ جہاں رانجھا جوگ لینے کے لیے بتایا جاتا ہے کہ آیا تھا لیکن یہ جگہ رنگپور اور جھنگ سے اس قدر دور واقع ہے کہ وہاں سے چل کر یہاں آنا اور کچھ نہ کچھ عرصہ رہنا اور پھر ہیر کے سسرال جانا عجیب بلکہ محال سا لگتا ہے۔ اس لیے یہ بھی ممکن ہے اس سے کوئی اسی نواح کا ٹلہ مراد ہو جہاں کے بڑے جوگی کو بھی بالناتھ کہہ کر داستان میں پکارا گیا ہے۔ کیوں کہ جغرافیائی یا تاریخی حقیقت سے شاعری کو دلچسپی نہیں تھی اور جس طرح یہ حکیم اپنے آپ کو لقمان کہہ سکتا ہے اور کہہ لیتا ہے بلکہ دوسرے بھی بعض کو اسی نام یاد کرتے ہیں اس طرح ہر معروف جوگی کو بالناتھ کہا جا سکتا تھا جو وصفی نام بھی ممکن ہے اور ضروری نہیں کہ مولودی نام ہوں۔ یہ قیاس میں نے اس لیے دوڑایا ہے کہ حمیداللہ ہاشمی صاحب اپنی تصنیف سید وارث شاہ میں لکھا ہے کہ چنیوٹ کے قریب کرانہ پہاڑی کی کسی جگہ کو بھی ٹلہ کہا جاتا تھا وہاں کے کسی جوگی کے پاس جا کر جوگ لینا زیادہ قرین قیاس بنتا ہے۔ بشرط کہ داستاں کو حقیقی تاریخ داستان ہی مانا جائے۔ ورنہ کسی پہاڑی کا کوئی ٹیلہ کام

دے سکتا ہے اور کوئی جوگی بالناتھ بنایا ٹھہرایا جاسکتا ہے کہ یہاں بھی اہم بات اس ادارے کا ذکر ہے جو نہ جانے کب سے قائم چلا آرہا ہے اور آج جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے جنڈیالہ کے ساتھ وارثی تعلق کے دو تین حوالے بنتے ہیں۔ ایک تو یہ مصرع کہ وارث شاہ وسنیک جنڈیالڑے دا' تے شاگرد مخدوم قصور والے" دوسرا یہ مصرع کے ۔ "احمد شاہ از غیب تھیں آن پوسی رب رکھ جنڈیالے نوں لیسیاوے" اور تیسرا ترجم قصیدہ بردہ کے آخر میں یہ شعر کہ ۔

ربا روز قیامت تیک وساویں شہر جنڈیالہ
کائی آفت پوے نہ اس تے وسے نت سکھالا

ان میں اول الذکر کی شہادت اس بنا پر کمزور پڑ جاتی ہے کہ ہوپ ایڈیشن (۱۸۶۰) میں یہ مصرع موجود نہیں ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ الحاقی ہے لیکن دوسرے مصرعہ کی حیثیت کو ابھی تک چیلنج نہیں کیا گیا اور اس میں جنڈیالے کے سر سے کسی بلا کے ٹل جانے کی آرزو آمیز دعا یا دعا آمیز آرزو گواہ بنتی ہے کہ اس سے وارث کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔

لیکن وہ کون سا جنڈیالہ تھا؟ اس کے لیے ہمیں امکانی حد تک ماضی کی اوراق گردانی کرنی پڑتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہرچند پنجاب میں اس کی کتنی ہی بستیاں تھیں۔ مثلاً" ایک جنڈیالہ ڈھاب والا وزیر آباد کے قریب ہے جس کا ذکر وارثی دور کے کسی حادثے یا واقعہ کے سلسلے میں نہیں ملتا اور وہ اتنا مختصر سا ہے کہ شاید ان ایام میں اس کا وجود بھی نہ ہو۔ ایک جنڈیالہ جالندھر کے قریب ہے اور چوں کہ وہ سلطان پور کے بھی قریب ہے جس کو نادر شاہ نے ۱۷۳۹عیسوی میں نذر آتش کیا تھا اس لیے امکان ہے کہ اس کی تپش جنڈیالے تک بھی گئی ہو اور (اگر وارث کا وہاں ہونا ثابت ہوجائے) یہ دعا یا تمنا شاعر کے لبوں سے نکلی ہو۔

دوسرا قابل توجہ جنڈیالہ (اس پہلو سے) جنڈیالہ گورو عاقل داس بنتا ہے جو امرتسر سے تقریباً" گیارہ میل مشرق کی طرف تھا بھی اور ہے بھی۔ اس کے متعلق عبرت نامہ میں جو تفصیل درج ہے اس کے مطابق سکھوں نے ۲۷ اکتوبر ۱۷۶۱ء کو امرتسر میں دیوالی کا تہوار منایا اور سربت خالصہ یعنی مجلس عاملہ میں ایک متا پکایا یعنی ریزولیشن پاس کیا کہ پنجاب کے ان حامیوں کے گڑھ چھین لیے جائیں جو احمد شاہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ان میں سے قریب ترین جنڈیالہ (عاقل داس) تھا۔ اس کے سربراہ (عاقل داس) کو خبر ملی تو اس نے ابدالیوں کی جانب شتر سوار بھیج دیا کہ اس کی مدد کو پہنچا جائے۔ احمد شاہ اطلاع پاتے ہی امداد کو لوٹا تو سکھ اس کی آمد آمد کا سن کر محاصرہ چھوڑ کر بیاس پار کر گئے (اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ امرتسر سے قربت والا جنڈیالہ محصور ہوتا ورنہ ان کو راوی پار کرنا پڑتا تھا)۔ مزید مذکور ہے کہ احمد شاہ ۲۹ دسمبر کو لاہور سے نکل کر محمود بوٹی آیا۔ جہاں اس نے پڑاؤ ڈالا اور وہاں سے وہ امرتسر دوسرے دن جا پہنچا جسے ان دنوں چک گورو بھی کہا جاتا تھا۔ وہاں سے یکم جنوری ۱۷۶۷ء کو اس نے جنڈیالے کا رخ کیا تاکہ ویرو وال میں پڑاؤ ڈالے۔

اب ہم جنڈیالہ شیر خان کی طرف آتے ہیں جہاں وارث شاہ کا مزار اسی بے کسی و بے بسی سے نکل چکا ہے جس کی طرف یادگار وارث کے مصنف نے ۱۹۳۵ء میں اشارہ کیا تھا۔ یہ جنڈیالہ شیخوپورہ کے قریب ہے اور اسے جنڈیالہ شیر خان کہنے کے دو جواز نکلتے ہیں۔ اولاً" یہ کہ وہاں کی پرانی اینٹوں کی تعمیر شدہ باولی میں ایک فارسی اشعار کی تختی ہے جو کہتی ہے اسے شیر خاں نے اکبری عہد میں بنوایا تھا۔ ثانیاً" یہ کہ وارث شاہ سے منسوب قصیدہ پڑھ کے پنجابی ترجمہ کے آخر میں مذکور ہے کہ مصنف کا نام سید وارث ہے اور پھر وہ دعا کی ہے جو اوپر تحریر کی

جا چکی ہے۔

لیکن یہ دعائیہ اشعار اگر ۱۱۵۲ میں لکھے گئے تھے جب نادر شاہ ہلاکت آفریناں کرتا ہوا (بمطابق ۶ فروری ۱۷۳۹) شاہ جہاں آباد کو جا چکا تھا اور وہاں سے وہ براستہ لاہور، پسرور، سیالکوٹ اور گجرات ہوتا ہوا اور لوکو وال کے مقام سے دریائے چناب کو پار کرتے ہوئے وطن کو چل دیا تھا تو ان کا سیاسی قرینہ کوئی نہیں بنتا تھا۔ بجز اس کے کہ ان اشعار کو اس دور کے رویے کے مطابق لیا جائے جس میں بستی اور بستی والوں کے لیے دعائیں لبوں پر آجایا کرتی ہوں گی۔

رہا یہ مسئلہ کہ اس کا نام کسی پرانی تحریر میں جنڈیالہ شیر خاں نہیں لکھا گیا تو بظاہر مترجم قصیدہ بردہ کو کسی واضح دلیل کے ذریعے جعلی ثابت نہ ہونے کی صورت میں وارث شاہ ہی کا اسی حوالے سے سمجھنا چاہیے جس حوالے سے ہم نے باوا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، وغیرہ کے کلام کو کسی تحریری مستند ثبوت کے بغیر سمجھا اور مانا ہے اور اگر یوں مان لیا جائے تو یہ بھی خود بخود ماننا پڑتا ہے کہ وارث شاہ کا تعلق جنڈیالہ شیر خاں ہی سے تھا۔

قصور

جنڈیالہ کے بعد وارث کے نزدیک قصور کی اہمیت ہے۔ اس نے اپنے آپ کو کسی "مخدوم قصور کا شاگرد بتایا ہے پھر اس نے کہا ہے کہ سارے پنجاب کی خرابی ایک طرف اور قصور کی خرابی ایک طرف اس سلسلے میں پہلے اظہار خیال کیا بھی جا چکا ہے اور ان ہی کو دہرانے کی جگہ یہاں اس کی اپنی اہمیت کا ذکر شاید زیادہ مناسب رہے اور کننگھم کے مطابق چونکہ یہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی بستی ہے اس لیے میرے خیال میں قصور کی جگہ کسور ہی اس کا موزوں نام ہے اور ہو گا بھی

کہ ق، اور ص، مسلمانوں کے ساتھ یہاں آئے تھے اور اس کی بنیادی خصوصیت قصور یعنی محلات نہیں (جو بہت بعد کی بات ہے) بلکہ اس کا کس (گستی) یعنی آبی گزرگاہ پر واقع ہونا تھا جو ایام گزشتہ میں بالخصوص کسی بستی کے مستقبل کی ضمانت ہوتا تھا اور یہ دریائے بیاس کے کنارے آباد تھا لیکن بعد میں جب دریا نے راستہ بدل لیا تو اس کی وہ اہمیت جاتی رہی اور مسلمانوں کے دور میں دریا اس سے ہٹ چکا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ بہلول لودھی کے زمانہ میں دریا اس سے ناراض نہیں ہوا تھا اور وہ شہر کی ایک جانب کی پاسبانی کرتا تھا چنانچہ اس نے اپنی دیپالپور کی صوبہ داری کے ایام میں یہاں بعض افغان قبائل کو جن میں سے بیشتر خویشگی کہلاتے تھے بسایا تھا اور بستی کی تینوں جانب تاکہ دریا والی جنوبی سمت کے علاوہ باقی سمتیں بھی دھاڑویوں سے محفوظ رہیں بالخصوص پیرا بلوچ سے جو ایک غارت کار تھا اور اس کا اپنا اڈا چونیاں میں تھا، ان افغانوں نے یہ کام مخلصانہ بھی کیا اور دلیرانہ بھی اور یہ صفات تیغ و تبر کے اس دور میں اکثر اپنی من مانی قیمت وصول کرتی تھیں۔ اس لیے تعجب نہیں کہ آہستہ آہستہ ان کی درباروں تک بھی رسائی ہوگئی اور آس پاس بھی ان کی دھاک بیٹھ گئی۔

ایسی بستیاں استحکام پکڑنے کے بعد اہل علم کا مرجع بھی بن جاتی رہی ہیں اور دو وجوہات سے ایک تو یہ کہ آبادی کے سربراہ کی سربراہی مقامی طور پر لکھنے والوں کو نسبتاً سکون سے رہنے کے مواقع فراہم کرتی تھی کہ مسلم کو اچھی ہی چیز سمجھا جاتا رہا ہے۔ دوسرے وہ سربراہ کشادہ دستی سے بھی اکثر کام لے جاتے تھے اور مدارس و مساجد میں رہنے والوں کی نان شبینہ کی زیادہ فکر نہیں رہتی تھی۔ چنانچہ سیرستان کا مصنف پری ابراہیم خان قصوری لکھتا ہے کہ قصور میں عالی شان عمارات تعمیر ہوئی تھیں اور لوگ مجموعی طور پر مال دار تھے۔ ادھر لاہور کے پیہم

یلغاروں کی زد میں ہونے کی باعث اہل حرفت و اہل علم ادھر کا رخ کرنے لگے تھے جو لاہور کے بعد مقابلتاً" قریب ترین آبادی تھی وہاں مسلمانوں کی کثرت تھی۔ چنانچہ شہر دیکھتے دیکھتے پھیلتا گیا۔

لیکن ایسے شہر حملوں کی زد میں بھی آجاتے ہیں اور حالات کا اندازہ کوئی بھی پہلے سے نہیں لگا سکتا۔ جب پہلے پہلے یہ بستی بسی ہوگی تو دریا کی قربت کے باعث اور یہ کس کے گمان میں تھا کہ کبھی دریا رخ پھیر جائے گا۔ اس طرح صدیوں سے چلی آرہی مغلوں کی حکومت کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ اورنگ زیب کے بعد اس قبائے سلطنت کو فلک پرزے پرزے کردے گا اور اس کی دھجیاں اڑنے لگیں گی۔ پارہ پارہ ہونے کے ان ایام ہی میں قصور کے ایک ابھرتے شخص حسین خاں خویشگی کی پنجاب کے گورنر عبدالصمد خاں سے ٹھن گئی اور ۱۷۲۰ء میں خویشگی کو اپنی جاں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یہ معرکہ چونیاں کے قریب ہوا اور بعد میں عبدالصمد خاں کے جیتے ہوئے قصور میں لوگوں کی زندگی کسی مد وجزر کے بغیر ہی گزرتی رہی۔ چنانچہ جانے والے لوگ پھر واپس آنے لگے اور بعض دوسرے بھی ادھر کا پھر سے رخ کرنے لگے اور قیاس ہے کہ ان ایام ہی میں وارث شاہ بھی کسی جذباتی یا غیر جذباتی اختیاری یا غیر اختیاری صورت حال کو قبول کرتا ہوا یہاں قصور میں پہنچ گیا۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے۔

دیپال پور

قصور سے نکل کر وارث شاہ کہاں سے ہوتا ہوا کہاں پہنچا بظاہر اس کا پتہ نہیں چلتا لیکن چوں کہ اس نے ملکہ ہانس میں بیٹھ کر ہیر رانجھا کی داستان کو مکمل کیا تھا اس لئے قیاسا" ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ وہاں سے ادھر ہی کا عازم ہوا تھا۔ ان ایام کے وسائل آمدورفت کو سامنے رکھتے ہوئے اور سیاسی حالات کے بھی پیش نظر اس کے لئے بیک جست ملکہ ہانس جا پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ جب اس کا بھی کوئی اشارہ نہ ملتا ہو کہ ملکہ ہانس کے کھرل والی سے اس کا کوئی پہلا تعلق نہ تھا اور جب یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ قبائلی زندگی گزار رہا تھا۔ چنانچہ یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ وارث شاہ وہاں سے نکل کر دیپالپور جا پہنچا ہوگا جو قصور کی طرح ہی ایک راج دھانی سی تھی۔ اس کا کہلانا بالفاظ امپیریل گزیٹر آف پنجاب دیپالپور تھا اور اسی گزیٹر میں لکھا ہے کہ اس کی تاسیس مذہبی حوالہ رکھتی تھی۔ جو ممکن بھی ہے لیکن محض نام سے یہ بات یقینی طور پر ثابت نہیں ہوتی کیونکہ دیپالپور اصلا" دیو پال پور ہوگا اور دیو پال، رجپال، جے پال وغیرہ نام لوگوں میں عام مروج تھے۔ بلکہ نویں صدی عیسوی میں بنگال کے ایک راجے کا نام دیو پال تھا۔ یوں دیوپال پور (دیپالپور) سے مراد وہ مسکن ہو سکتا ہے اور ہوگا جو کسی دیو پال نے بسایا تھا۔ کننگھم کی کنج کاریوں کے مطابق چوں کہ وہاں سے (الحاق پنجاب کے بعد) ایام قدیم کے سکے حاصل ہوئے ہیں اس لئے اسے قدیم ترین مسکنوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کے دور اقتدار میں (لیکن آل بابر سے پہلے) جب منگولوں کے حملے شروع ہو گئے تو بلبن نے مزاحمتی اور حفاظتی تدابیر ضروری جانا۔ چنانچہ قدیم قلعوں

کی از سر نو تعمیر و مرمت کروائی گئی اور منگولوں کی یلغاروں کی راہ میں نئے قلعے بنوائے گئے۔ دیپالپور میں فوجی دستے رکھے گئے جس کی حیثیت اور دفاعی اہمیت تیرہویں صدی کے آخر میں اور چودہویں صدی کے آغاز میں لاہور سے کسی طرح کم نہ تھی اور ۱۲۸۵ میں اسی محاذ پر بلبن کا چہیتا بیٹا (شہزادہ محمد) منگولوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے مارا گیا تھا اور فارسی کا مشہور شاعر امیر خسرو جو وابستہ دربار بھی تھا اور شہزادہ کے ہمراہ تھا گرفتار ہوا تھا اس کا یہ شعر اسی حالت اسیری کا ہے۔

من کہ بر سر نمی نہادم گل - بار بر سر نہاد و گفتہ جل

خسرو نے شہزادہ کی شہادت پر بڑا دردناک مرثیہ بھی لکھا تھا۔

یوں اپنی دفاعی اہمیت کے باعث جب خطرہ شمال مغربی دروں کی جانب سے ہوتا تھا اور منگولوں نے ۱۲۲۱ سے لے کر ۱۵۲۸ تک کم سے کم دس بار جنوبی پنجاب میں حملے کیے۔ دیپال پور انگریزی اقتدار سے پہلے ایک اہم فوجی چوکی کی حیثیت رکھتا تھا جہاں لوگ عام حالات میں دوسری جگہوں کی نسبت اپنے آپ کو زیادہ محفوظ خیال کرتے تھے۔ خیال ہے کہ وارث شاہ بھی یہی جان کر قصور سے عازم دیپالپور ہوگیا ہوگا۔ اس بنا پر بھی کہ ۱۷۵۸ء میں اس پر مرہٹوں کے عارضی قبضے کے بعد یہ جگہ ایک افغان خاندان کے زیر تسلط آگئی تھی جن سے ممکن ہے کہ قصوری دور کا کوئی حوالہ نکل آیا ہو لیکن پھر وارث شاہ کا ملکہ ہانس جا پہنچنا ظاہر کرتا ہے کہ دیپالپور کی سیاسی یا سماجی یا معاشی فضا اسے راس نہ آئی ہوگی یا اس کے ملکہ ہانس کے سردار عظیم کی "بندہ پروری" کی کوئی داستان سن کر یہاں سے چل دینے کو ترجیح دی ہوگی کہ ماضی میں چھوٹے بڑے بھروالیوں یا وڈیروں سے متعلق ایسی داستانیں عام اڑا کرتی تھیں بلکہ بنی جاتی تھیں۔

دیپالپور کے متعلق یہ بھی ذہن میں رہے کہ باری دوآب کے باقی علاقے

کی طرح نہروں کے نکلنے سے پہلے یہاں زرعی صورت حال ہرچند آج کی سی نہیں تھی پھر بھی بارشوں کے موسم میں بیاس اور ستلج مل کر جب کناروں سے اچھل پڑتے تو نواحی علاقے کو روئیدگی کے لئے زیادہ سازگار کرجاتے تھے اور لکھی جنگل اسی دیپالپور سرکار کا ایک حصہ تھا جو لوگوں کی بعض ضرورتیں بھی پوری کرتا تھا لیکن قانون شکنوں کی پناہ گاہ بھی بنتا تھا۔ جن کا کام مسافروں کو لوٹ لینا ہوتا تھا یا کسی بستی کو' اور ڈھور ڈنگروں کو ہانک لے جانا تو عام دستور تھا۔ جن کو وارث شاہ نے رانجھے کا چوچک سے تعارف کرواتے ہوئے دھاڑوی کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دھاڑدیوں سے "دھارا" یعنی دھالہ مار کے ڈھور چھڑا کر لے آنے کے کس بل رکھتا ہے۔ اور ایسے دھاڑ دیوں ہی کے خطرے سے لوگ اکثر کوٹ بناں یعنی فصیل دار گاؤں بنا کر رہتے تھے اور وارث نے بھی اسی بنا پر دیپالپور کو ترجیح دی ہوگی۔ اگرچہ اس کے اس مصرع سے بھی قیاس اس طرف جاتا ہے چغلی نہیں دیپالپور کوٹ جیہی او نمرود دے تھاؤں بے مہرنی۔ بلکہ ہوسکتا ہے یہاں اسے کسی چغل خور کی چغلی کے منفی نتائج بھگتنے پڑے ہوں اور دیپالپور کو چھوڑ دینا پڑا ہو۔ کیوں کہ ایسے کوٹوں میں جو کسی بڑی شخصیت یا قبیلے کے زیر نگین ہوتے تھے ان کے اندر غلط فہمی جاگ پڑنے یا جگا دینے سے وہاں رہنا دوبھر ہوجاتا تھا اور اکثر جان کا خطرہ رہتا تھا۔ جیسے ہیر دمودر میں کیدو چوچک کو کہتا ہے کہ میں ہیر کو ناراض کرکے یہاں رہ نہیں سکتا اور اگرچہ منٹگمری گزیٹیر میں ایک کہاوت نقل کی گئی ہے کہ "شور شوروں' تے کوڑ لاہوروں 'جھگڑا چنیوٹوں' پیو پتر تے جغلی کرے دیپالپور دے کوٹوں"۔ اور یوں مرقومہ بالا مصرع میں وارث شاہ کا اشارہ کسی ذاتی واقعہ کی طرف ضروری نہیں ہے محض ایک کہاوت کا بیان بھی ہوسکتا ہے لیکن اگر ذاتی سربیتی نہیں تو اس کے ذکر کی ایسی کون سی ضرورت تھی۔ اس لئے میرے خیال میں

ضرور وارث کسی ناملائمت سے دوچار ہوا ہوگا جس کے بعد وہاں رہنا دشوار ہوگیا ہوگا۔

دیپالپور اور وارث کے سلسلے میں یہ خیال مجھے تاریخ فیروز شاہی کو دیپالپوری حوالے سے پڑھتے ہوئے ہی آیا تھا۔ اس میں ایک جگہ مصنف (برنی) لکھتا ہے کہ ضعیفی کی وجہ سے میرے منہ میں ایک دانت بھی باقی نہیں رہا ہے اور میں پریشان حال اور دشمن کام ہوگیا ہوں اور مخالفوں اور حاسدوں کی لکدکوب سے پست ہوگیا ہوں۔ یعنی دشمنوں کی مراد کے مطابق تباہ و برباد ہوگیا ہوں۔ ایک اور جگہ وہ مزید وضاحت کرتا ہے کہ دشمنوں نے ریشہ دوانیاں کرتے ہوئے اسے دربار و ارباب و اختیار سے ہی دور نہیں کردیا ہے وہ اس کی جان سے بھی درپے ہیں اور میں خلوت و عزلت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ کمر جھک گئی ہے۔ عاجز و بے چارہ ہوگیا ہوں۔

'مگر خدائے کشاید درے ز رحمت خویش کہ سخت عاجز و بے چارہ و غمین و حزینم

اور شاہان جہاں کے درباروں کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے سعدی نے جسے ایک نعرہ میں بیان کردیا تھا کہ "گاہے بسلطے بر یجنند و گاہے بدشنامے خلعت دہند"۔ ورنہ اسے ایک ایسی جگہ سے جو صدیوں سے اسلامی تہذیب و ثقافت کا گھر بنا ہوا تھا۔ بلاوجہ چل پڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان ایام میں داؤد خاں (قصوریہ) وہاں مرہٹوں کے مامور ہری سنگھ کو بے دخل کرکے دیپالپور پر قابض ہوگیا تھا لیکن اس کے متعلق مرقوم ہے کہ وہ بڑا سفاک اور بے اصولا بھی تھا اور عوام کے لئے سخت گیر۔ ہوسکتا ہے اس کی سخت گیر فضا سے دل برداشتہ ہو کر وارث شاہ نے وہاں سے نکلنے ہی میں عافیت جانی ہو۔

ملکہ ہانس

اس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ شاہ جہان کے دور میں اسے بسایا گیا تھا جسے فیروز شاہ تغلق کی طرح جگہ جگہ بستیاں بسانے کا شوق تھا۔ اس سلسلے میں ایک شخص ملک محمد کا نام لیا جاتا ہے۔ جو ہانس قوم سے تھا۔ ادھر ملتان گزٹیئر (۲-۱۹۰۱) میں ایک سند منقول ہے جو دارا شکوہ نے گردیزیوں کو بالفاظ سند آبادی و معموری پرگنہ عالم پناہ کے پیش نظر عطا کی تھی اور ۲۱ محرم الحرام کو بمطابق ۳۰ سال جلوس شاہی (یعنی ۱۶۵۰ عیسوی میں)۔ یوں یہ روایت بھی روایت نہیں رہتی کہ اورنگ زیب کے دور میں شیخ قطب ہانس کو سند اور جاگیر کی صورت میں مراعات سے نوازا گیا ہو۔ منٹگمری گزٹیئر (۹۹-۱۸۹۸) کے مطابق شیخ قطب پڑھا لکھا آدمی تھا اور دہلی کے وابستگان میں سے کسی تک اسی حوالے سے اس کی رسائی ہو گئی تھی جیسے عبدالحکیم سیالکوٹی کی شاہ جہاں تک ہو گئی تھی۔ گزی ٹیئر میں مرقوم ہے کہ ۱۶۶۳ میں عالمگیر نے شیخ قطب کو سند عطا کی تھی اور تعلقہ قطب آباد میں کئی گاؤں بھی مرحمت کیے تھے۔ قطب آباد اسی مورث کے نام پر آباد کیا گیا تھا پرانی سہاگ کے کنارے اور ملکہ ہانس سے تقریباً جنوب کی جانب۔ اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر شیخ مذکور نے دربار میں اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ ادھر اس کے علاقہ میں سے تین نالے گزرتے تھے (سہاگ، پارا اور دیدڑ) جس سے اپنی اراضی کی زرخیزی کے ذریعے وہ آسودہ تر ہوتا گیا تھا۔

مغلیہ اقتدار کی باگیں ڈھیلی ہونے پر باقی دور دست علاقوں کے اقتدار دوست سیف کی طرح اس علاقے میں بھی مرکز گریزی انگڑائیاں لینے لگی اور ہانسوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ جن میں سے ۱۷۶۴ عیسوی میں محمد عظیم اپنی قوم کا

سربراہ تھا۔ اس نے ملکہ کے آس پاس کا علاقہ زور بازو سے اپنے قبضے میں کرلیا (اور ان دنوں وارث شاہ ملکہ میں آچکا تھا) لیکن دو برس بھی نہ گزر پائے کہ بھنگی سرداروں (جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ) نے ملتان پر حملہ کرتے ہوئے محمد عظیم کو بھی وقتی طور پر بے دخل کردیا کیوں کہ جلد ہی اس علاقے سے ان کی پہلی سی دل چسپی نہ رہی اور محمد عظیم کو دوبارہ علاقہ واپس لینے کا موقعہ مل گیا۔ منٹگمری گزیٹر کے مطابق یہ بارگیری ۱۷۶۲ سے ممکن ہے قدرے پہلے ہوئی ہو یا قدرے بعد۔ کیوں کہ ان ایام ہی میں ہیرا سنگھ نکئی ایک لڑائی میں مارا گیا تھا اور پاک پتن کا دیوان عبدالسبحان بھی قتل کیا گیا تھا۔

یوں قرائن کہتے ہیں کہ محمد عظیم کی بے دخلی کے بعد وارث شاہ بھی وہاں سے بے دخل ہوگیا ہوگا۔

اس حادثے کے بعد جس میں قمر سنگھ نکئی نے محمد عظیم کو مکاری کے ساتھ گرفتار کرلیا تھا اور وہ قید ہی میں مرا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد میں ملکہ کی ملکائی اس کے بھائی محمد حیات کو مل گئی لیکن اس نے عبدالسبحان کے جاں نشین غلام رسول سے مخاصمت آغاز کردی اور جب کمزوری محسوس کی تو بھروالی سکھوں سے امداد طلب ہوا اور آدھی مالکی دے دینے کے عوض۔ بھروالیوں نے (جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے) امدادی معاوضہ تو نقد اور فوری طور پر وصول کرلیا لیکن پاک پتن کے دیوانوں کے خلاف ساتھ دینے سے گریز کرگئے۔ اس کا توڑ محمد حیات نے ڈوگروں کی امداد میں ڈھونڈا اور وہ بھروالیوں کو شکست دینے میں کامیاب بھی ہوگیا لیکن اب سوہاگ، پارا اور دہدڑ ناراض ہوگئے اور زمین کی ساری زرخیزی جاتی رہی۔ یہاں پھر قیاس کہتا ہے کہ وارث کو محمد حیات ہانس کی یہ بات نہیں بھائی ہوگی کہ وہ پاک پتنیوں کے مقابلے کے لئے بھروالیوں سے امداد فوری کرے اور محمد

حیات کی بحالی اور قدرت کی خشک آبی کی صورت میں ناراضگی نے اسے وہاں سے چل دینے پر مجبور کردیا ہوگا اور ہو سکتا ہے یہی وہ معرکہ ہو جس میں بیٹے نے محمد حیات اور بھروالیوں کا ساتھ دیا ہو اور پسر نوح کی جگہ نوح کو ڈبو دینے ولا یہ سیلاب وارث کو گمنام دن گزارنے پر مجبور کرگیا ہو۔ ملکہ کا پرانا قصبہ پرانی جسامت کی مخصوص چھوٹی اینٹوں کا بنا ہوا لگتا ہے اور جسے وارث کے بعض سوانح نگاروں نے "اچہ بہ" لکھا ہے اور قصبے کا محلہ وہ کبھی یہاں کے والی ہانس کا کوٹ ہوگا اور قطب آباد کے بعد اسے بھی جدی جگہ کے حوالے سے اخلاف نے تعمیر کیا ہوگا۔ عمر رسیدہ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں سے پرانے سکے کھدائی کرنے والوں کو اکثر مل جاتے تھے۔ اسی "اچے بجے" پر وہ مسجد بھی ہے جسے وارث شاہ کی مسجد کہا جاتا ہے اور جس پر ایک تختی سی لکھ کر لٹکا دی گئی ہے کہ یہ مسجد ۷۴۰ھ کی ہے یعنی ۱۳۳۹ عیسوی سال کی اور جو تغلقی دور کی بنتی ہے۔ اس امکان کو ہرچند ٹالا نہیں جاسکتا کہ اندرونی اور بیرونی مسلمان طالع آزماؤں کے لیے یہ علاقہ اجنبی نہیں تھا بلکہ شمال مغربی جانب سے آنے والے تاجر بھی ڈیرہ اسماعیل خاں میں سے ہو کر ادھر سے گزرتے تھے اور دیپالپور کے ایک دروازے کا تو نام ہی ملتانی دروازہ تھا جس کو عمداً" بھی اور کرہا" بھی ملتان کی جانب سے آنے والوں کے لئے چشم براہ رہنا پڑتا تھا اور جہاں ۷۴۰ھ سے پہلے ہم غیاث الدین بلبن کو ہانس کے اسی علاقے میں متعین پاتے ہیں اور پھر اس کے بیٹے سلطان محمد شہید کو اور اس کے بعد کے دور میں منگولوں سے تصادم کے حوالے سے میاں غیاث الدین تغلق داد شجاعت بھی دے چکا تھا اور اسے پکا مسلمان بھی بتایا جاتا ہے لیکن ہانس میں کسی مسجد کی تعمیر کا ثواب اوراق تاریخ میں ان میں سے کسی کے نام درج نہیں ہے۔ جب کہ تھوڑا عرصہ بعد ہی فیروز شاہ تغلق نے دیپالپور میں مسجد بنوائی اور اس کا

ثواب اسے آج تک ملتا آرہا ہے اور اگر تختی آویزاں کرنے والوں کے پاس کوئی ثبوت موجود ہے کہ وہ مسجد واقعی اسی سال ہجری میں بنائی گئی تھی تو اس حوالہ کا وہاں تحریر میں آنا بہت ضروری ہے خصوصاً" جب وہ اوقاف کے قبضہ میں آچکی ہے۔

یہ ممکن ہے کہ مسجد اورنگ زیبی دور میں نوازشات شاہی کے ساتھ خوشنودی شاہ کے لئے شیخ قطب کے ایام میں بنوائی گئی ہو کیوں کہ اس کے بعد اس قبیلے میں علم و فضل کے حوالے سے کسی کا ذکر نہیں ملتا۔ اس میں موجود حجرہ جسے حجرہ وارث بتایا جاتا ہے۔ اس کے حلیہ بگڑ چکا ہے اور جس جگہ وہ اس وقت سے اور جس انداز میں ہے اس سے اب اندازہ لگانا دشوار ہوگیا ہے کہ وہ کب تعمیر ہوا تھا۔ حجرہ کی جو بھی حقیقت ہو اسے وارث شاہ کا حجرہ قرار دینا مزید تحقیق کا محتاج ہے۔ غالباً" یہ صورت یوں پیدا ہوئی کہ لوگوں نے خود ہی تصور کرلیا کہ چوں کہ ہیر میں درجنوں بڑی بڑی مذہبی اور فقہی کتابوں کے نام مذکور ہیں اس لئے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو ضرور مسجد نشینی اور حجرہ گزینی سے ہی دلچسپی ہوگی۔ حالانکہ شاہ صاحب کا مزاج وہ تھا جس کی طرف انہوں نے آغاز کتاب میں اشارہ کیا ہے کہ۔

یاراں اساں نوں آن سوال کیتا عشق ہیر دا نواں بتائیے جی
ایس پریم دی جھوک دا سبھ قصہ جیبھ سوہنی نال سنائیے جی
نال عجب بہار دے شعر کہہ کے رانجھے ہیر دا میل ملائیے جی
یاراں نال مجالساں وچ بہہ کے مزہ ہیر دے عشق دا پائیے جی

یعنی حجرہ گزینی میں اور اس مزاج میں بعد الطرفین ہے۔

اسی مسجد یا حجرہ گزینی سے ٹھٹھہ جاہد اور بھاگ بھری والی داستان پھوٹی۔ یہ جگہ اصل میں ملکہ ہانس ہی کا ایک حصہ تھا اور خود ضلع گوجرانوالہ میں بھی اس کا وجود اس کی دلیل بنتا ہے کہ کبھی یہ نام جنڈیالہ کی طرح لوگوں میں مقبول ہو گا۔ اصل میں قدیم ایام میں جہاں کوئی قلعہ، گڑھی یا کوٹ ہوتے وہاں عام طور پر فصیل سے باہر (لیکن حد حفاظت کے اندر) ایسی کوئی نہ کوئی بستی بس جاتی تھی اور عموماً" زبردست لوگوں کی جسے یا تو ان کے وسیلہ معاش کے حوالے سے ٹھٹھی فلانی کہا جاتا تھا یا کوٹ والے کی سرپرستی کا حوالہ اس میں شامل کرلیا جاتا تھا، یا ٹھٹھی ہی کے کسی نمود پسند اور باقیوں سے بلند شخص کے نام سے وہ موسوم ہو جاتی تھی۔ اسی لیے یہاں یہاں بھی اسے اولا" لوہارن ہی کہا گیا۔ زبردستی کی بات میں نے اس لئے کی ہے کہ زبردست تو فصیل کے اندر اپنا حصہ لے کر رہتے تھے اور کسی کے سایہ دیوار میں رہنا انہیں کب اور کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔

پاک پتن

وارث شاہ نے ہیر کی داستان کے آغاز میں اس جگہ کو جسے پہلے اجودھن کہا جاتا تھا پاک پتن بنانے والی شخصیت کی یوں مدح سرائی کی ہے۔

مودود دا لاڈلا پیر چشتی شکر گنج سعود بھرپور ہے جی
قطباں بائیاں دے وچ پیر کامل جنیدی عاجزی زہد منظور ہے جی
خاندان وچ چشت دے قابلیت شہر فقر دا پٹن معمور ہے جی
شکر گنج نے آن مکان کیتا دکھ درد پنجاب دا دور ہے جی

لیکن باوا فرید شکر گنج کے یہاں ڈیرا لگانے سے بہت پہلے یہ جگہ مسکون تھی

اور اجودھن کے نام سے موسوم تھی جس کے بنیادی معنی گزرگاہ یعنی گھاٹ یا پتن کے ہیں۔ جنرل کننگھم کے حوالے سے منٹگمری ضلع کے گزیٹر ہیں (ص ۲۳۷) پر یوں مرقوم ہے کہ یہ جگہ قدیم ایام سے بہت اہم رہی ہے اور صدیوں ستلج سے آرپار جانے کی جگہ۔ یہ مقام ڈیرہ غازی خاں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کی شاہراہوں کا سنگھم تھا۔ یہاں سے ہی محمود غزنوی کا گزر ہوا۔ تیمور کا گزر ہوا۔ بلکہ مشہور سیاح ابن بطوطہ کا بھی۔ سبکتگین نے ۳۶۷ ہجری میں اس پر قبضہ کیا۔ پھر ۴۷۲ھ میں ابراہیم غزنوی نے اور جب تیمور نے لشکر کشی کی تو اس کی غارت گری کی باتیں سن کر لوگ اس شہر کو خالی کر گئے لیکن جو وہیں رہے ان سے باوا صاحب کے مزار کے تقدس کی بنا پر اس نے کوئی تعرض نہ کیا۔

ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں (۱۳۳۴ عیسوی) اس جگہ کا نام اجودھن ہی لکھا گیا ہے۔ اسی طرح تیمور کے وقائع نگاروں نے بھی تقریباً" نصف صدی بعد اس کو اسی نام سے یاد کیا ہے۔ جیسا کہ آئین اکبری میں بھی اسے محض پتن کہا گیا ہے لیکن منٹگمری گزیٹر کے مطابق (ص ۲۳۸) پاک کا اضافہ اکبری دور میں اس وقت ہوا جب اس وقت کے سجادہ نشین حضرت میرالدین کی دعا سے بادشاہ کے ہاں وارث تخت پیدا ہوا اور اگر ان دونوں میں تطبیق نہ ہو تو بھی پاک اضافہ باواجی کی ذات گرامی ہی کا مرہون تھا اور ہے اور اگر اوراق تاریخ میں اکبری عہد میں اسے پاک پتن نہیں لکھا گیا تو اس کا سبب اس دور کے شاہی وقائع نگاروں کی سوچ کی وہ جھکاوٹ بھی ہو سکتی ہے جو ان کے دامن کا نمایاں داغ گنی ہے ورنہ اس سرزمین کے لوگ خود بخود ہی ایسی جگھوں سے پہلے پاک کا اضافہ کر لیتے ہیں یا بعد میں شریف کا اضافہ کرتے ہیں اور اجودھن کی جگہ پاک پتن یا محض پتن کہتے ہیں اس رویئے کو بھی دخل تھا کہ بزرگوں کے مقامات کا نام لینا ادب سے ہٹی ہوئی بات گنی

جاتی تھی اس لئے اس کا متبادل انتخاب کرلیا جاتا تھا اور یوں پاک پتن آہستہ آہستہ بے دخل کر گیا جس میں سے لوگوں کو اجودھیا کے حوالے سے ہندویت کی بو آتی ہوگی یا ویسے ہی وہ غیر مانوس سے سا لگتا ہوگا۔

لیکن نام میں کیا دھرا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وارث شاہ کے زمانہ میں لوگوں کو اس مزار پر ثواب یا احتیاج کی بنا پر حاضری دیتے تقریباً" پانچ سو سال ہو چکے تھے کہ باوا جی کا وصال ۵ر محرم ۶۷۹ھ (۷ر مئی ۱۲۸۰ء) میں ہوا تھا اور وارث شاہ ۱۱۸۰ء میں اسی لے دیس میں تھا اور اس کے وہاں سلام کرنے کے لیے جانے کے دو حوالے بنتے ہیں۔ ایک تو وہ عقیدت جو اسے باوا جی سے ان کے روحانی مقام کے باعث تھی اور ایک وہ عظمت جو ان کو پنجابی زبان کے روحانی شاعر ہونے کی حیثیت سے حاصل تھی۔ اگرچہ یہ تحقیق معلوم نہیں کہ زیارت مزار کی سعادت اسے کب حاصل ہوئی اور ایک بار ہوئی یا ایک سے زیادہ بار۔ قیاس ہے کہ جب ملکہ ہانس سے اس کا آب و دانہ اٹھ گیا ہوگا تو اپنی زندگی کا تو یہ آخری سلام سمجھ کر ضرور وہاں جانے اور زیارت سے فیض یاب ہونے کا خیال آیا ہوگا یعنی ۱۱۸۰ ہجری میں یا اس کے بعد اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس زیارت کو اس نے سالانہ عرس کے ساتھ یک جا کر لیا ہو۔ یعنی ۱۱۸۱ ہجری کی ابتدا اس نے اسی سے کی ہو کہ باوا جی کا عرس یکم محرم سے پانچ محرم تک منایا جاتا ہے اگرچہ یادگار وارث میں 'پنجابی شاعراں دا تذکرہ" میں اور شاید اسی حوالے سے بعد میں حمیداللہ ہاشمی کی تصنیف "سید وارث شاہ" میں بلکہ عذرا وقار کی تصنیف "وارث شاہ عہد اور شاعری" میں بھی یہی مذکور ہے کہ شاہ صاحب قصور سے فارغ التحصیل ہو کر باطنی فیض حاصل کرنے کی غرض سے پاک پتن گئے تھے۔

لاہور

وارث شاہ کا لاہور سے بظاہر کوئی گہرا تعلق نظر نہیں آتا لیکن اگر اس کا مولد جنڈیالہ شیر خاں ہی تسلیم کیا جائے تو پھر جیسا کہ گورنمنٹ آف پاکستان کے ۱۹۸۴ء میں شائع کیے گئے روال پنڈی اور لاہور کمشنریوں کے متحدہ نقشے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے شیر خانی جنڈیالہ سے قصور پہنچتے ہوئے لاہور راہ میں ہی پڑتا تھا جو گہوارہ علم و ادب و عرفان بھی تھا اور مرکز تیغ و سنان و رومان بھی۔ جس طرح ہیر کے بعض مصرعوں میں سے جھلکتا ہے وارث شاہ نے ضرور وہاں (عارضی ہی سہی) قیام کیا ہوگا اور وارث شاہ ایسے بے وسیلہ نوجواں کے لیے تو قافلوں کے ساتھ اپنے آپ کو کسی لمبے سفر کے لیے وابستہ کرنا ناگزیر تھا اور ہو سکتا ہے کہ یہ سارا سفر اس نے ان ایام میں کیا ہو جب لاہور عبدالصمد خان اور اس کے بعد زکریا خاں کے ملے جلے تقریباً" بیس سالوں میں شور و شر سے بستا" محفوظ تھا کہ ابھی نہ تو نادری آگ بھڑکی تھی نہ ہی ابدالوی اور بندہ بیراگی کی سرکشی و سرتابی اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی تھی لیکن جیسا کہ پہلے بھی متن میں اشارہ کیا جا چکا ہے لاہور مغلوں کے سرحدی صوبے کا صدر مقام ہوتے ہوئے اور اس شاہ راہ پر واقع ہونے کے باعث جو درہ خیبر کو دہلی سے ملاتی ہے ہمیشہ ہی خطروں کی زد میں رہا ہے لیکن یہ سرراہ ہونا ہی اسے اپنے محل وقوع کے لحاظ سے شاید اسے وہ اہمیت بھی دے گیا کہ غزنوی دور سے کسی نہ کسی رنگ میں صدر مقام بھی بنا رہا ہے اور سعد سلمان نے بارہا اسے اپنے اشعار میں یاد کیا جو محمود غزنوی کے بیٹے سعود کے قریبی شعرا میں سے تھا اور سوائے اورنگ زیب کے اس کے تمام پیش رووں کی توجہ کا مرکز رہا اورنگ زیب کے دکن میں الجھ کر رہ جانے کا بالواسطہ پنجاب پر وہی اثر پڑا

جو کسی ادارے کے سربراہ کی مسلسل غیر حاضری کا پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ جہاں وفاقی صدر مقام کی حالت ڈھیلی لگام والے گھوڑے کی سی ہو گئی وہاں پنجاب ایک لحاظ سے عناں گستہ ہو گیا اور بندہ بیراگی ایسے لوگوں کے سرکشی کرنے کے لیے نکل آیا اور لاہور بھی اس سے متاثر ہوا۔ بلکہ سارے کا سارا مشرقی پنجاب کا علاقہ بندہ بیراگی اور سرکاری افواج کی محاربتی آنکھ مچولی برسوں تک جاری رہی تا آنکہ بندہ بیراگی گرفتار ہو کر ۱۹ جون ۱۷۱۶ء کو اپنے بہت سے ساتھوں کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ سکھوں میں اس واقعہ کو قتل عام کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک طرف تو سکھوں میں بندہ بیراگی کی سی قائدانہ صلاحیتوں والا کوئی جاں نشین نہ ابھرا اور دوسری طرف یہ لاہور کو عبدالصمد خاں اور اس کے بعد زکریا خاں جیسے حاکم مل گئے جنھوں نے شورشوں کا مقدور بھر راستہ بند کیے رکھا اور عین ممکن ہے کہ ان ''سبتا'' پر سکون ایام ہی میں وارث شاہ لاہور میں کچھ عرصہ اقامت گزیں ہو کر پھر یہاں سے عازم قصور ہو گیا ہو اور لاہور کو اس کے مزاج نے قبول نہ کیا ہو کیوں کہ اسے ہم یہاں سے نکل جانے کے بعد نہ اسے یاد کر پاتے ہیں نہ اس کے مصائب پر کڑھتا ہوا دیکھتے ہیں حالانکہ بندہ بیراگی کے بعد لاہور کو ملکیوں اور غیر ملکیوں کے ہاتھوں کیا کچھ نہ دیکھنا پڑا۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے لاہور کا رخ ہی نہ کیا ہو اور مال زادیوں کے طور طریقوں اور ان کے خیموں کی باتیں اس نے ہم ذوق ہم عمروں ہی سے سنی ہوں یا قصور میں ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو کہ ان ایام میں ان کے طائفے جگہ جگہ جاکر تسکین چشم و گوش و جسم و جاں بنا کرتے تھے۔

ضمیمہ

جیسا کہ اوراق گزشتہ میں اشارہ کیا جاچکا ہے جناب طالب بخاری کی وارث شاہ کے حالات زندگی کے متعلق تحقیق آج تک کی تمام تحقیقات سے مختلف ہے۔ انہوں نے اپنی اس تحقیق کو پی ایچ ڈی کے لئے پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا ہے۔ جس کی کتاب ہذا سے تعلق رکھتی بعض سطور کو بلا تبصرہ شامل کیا جا رہا ہے اور بخاری کے شکریہ کے ساتھ۔

(مولفین)

وارث شاہ اور ان کی آفاقی تخلیق "ہیر رانجھا" کے کردار اور انکے ٹھکانوں کے بارے میں تاریخوں، تذکروں، افسانوں، رسالوں اور سفرناموں میں کوئی ٹھوس بات نہیں ملتی خاص طور پر ان کی زندگی کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اکثر دانشوروں کی تحریروں سے صرف اتنی سی بات کا سراغ ملتا ہے کہ آپ کے والد صاحب کا نام قطب شاہ اور ان کے استاد گرامی کا نام مولوی غلام مرتضیٰ سکنہ قصور تھا اور ان کا درس بھی قصور میں ہی تھا لیکن جب ہم وارث شاہ کے حقیقی چھوٹے بھائی سید قاسم شاہ سکنہ جنڈیالہ شیر خاں کی لکھی ہوئی "سوانح عمر وارث شاہ" ۱۲۲۰ھ (مخطوطہ) پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ کے والد کا نام گل شیر شاہ اور استاد کا نام مخدوم قاضی سید سلامت شاہ قاضی قصوری سکنہ جنڈیالہ شیر خاں تھا اور وہ آپ کے حقیقی ماموں اور جنڈیالہ شیر خاں کے قاضی بھی تھے اور وہیں مسجد میں ان کا درس بھی تھا۔

آپ پنجابی، فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی، بھاکھا، سنسکرت، بلوچی، پشتو، سندھی اور چینی زبانوں کے عالم بھی تھے اور فنون لطیفہ سے رغبت بھی رکھتے تھے۔

ملکی اور غیر ملکی سیاحت بھی کی تھی جیسے دلی، بمبئی، آگرہ، مدراس، کلکتہ، سندھ، سرحد، بلوچستان، چین، کشمیر، ایران، عراق، فلسطین، مصر، سعودی عرب اور روم وغیرہ۔ دوران سیاحت آپ نے دو تین حج بھی کیے تھے۔ خاندان اہل بیت رسول کے مزارات کا شرف بھی حاصل تھا اور حضرت شمس تبریزی، سعدی اور حافظ شیرازی کے مزارات پر فاتحہ خوانی بھی کی تھی۔ پیرس میں قلوپطرہ کا بت بھی دیکھا تھا اور واپسی کے بعد تاج محل اور قلوپطرہ کا مٹی کا ماڈل بھی بنایا تھا جس پر آپ پر حد شرعی آپ کے ماموں سید سلامت شاہ نے لگائی تھی اور یہ دونوں شاہکار مسجد اور مندر میں نصب کروائے گئے تھے۔ آپ نے "لقمان بیگم" دیوی چند سکنہ لاہور سے باقاعدہ طب پڑھی تھی اور "طب وارث" نامی کتاب بھی لکھی تھی اور یہی آپ کے دو شاہکار تھے۔ دانشوروں نے آپ کے نام پر دو اور کتابیں سسی، سوہنی وغیرہ بتائیں ہیں سوانح عمری وارث شاہ میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔

"ہیر کی حقیقت معلوم کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ دمودر سے لے کر وارث شاہ اور بعد میں "ہیر" لکھنے والوں حامد شاہ عباسی، احمد یار مرالوی، فضل شاہ نوانکوٹی، مولا بخش کشتہ، دین محمد سوختہ امرتسری اور استاد دائم گجراتی وغیرہ کی "ہیر" کی کہانی، واقعات اور کرداروں کے نام میں خاصا فرق تھا اس لئے اس قصے کی حقیقت یا اصلیت معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ دمودر نے یہ قصہ سب سے پہلے "ہیر" کے عہد سے سو برس بعد اور وارث شاہ نے بھی قصہ تین سو سال بعد "ہیر" لکھا اور اپنے قیاس سے لکھا تھا۔

ہماری اس تحقیق کی بنیاد دو قلمی نسخوں: سوانحعمری وارث شاہ ۱۲۲۰ھ اور "تاریخ ہیر" (فارسی نثر) ۸۸۶ھ مصنفہ مراد بلوچ (سہتی کا عاشق) سکنہ ڈیرہ ہیبت خاں ضلع مظفر گڑھ پر ہے۔ یہ دونوں قلمی نسخے ہمیں ملک غلام حسین کھوکھر رئیس

جنڈیالہ شیر خان ضلع شیخوپورہ کے کتب خانے میں ۱۹۴۵ء میں ملے۔

ہیر رانجھا کبھی بھی ایک دوسرے کے عاشق نہیں تھے۔ ان کا بچپن میں ہی شرعی نکاح چوچک خان کی زندگی میں کوٹلی باقر شاہ میں قاضی شمس الدین نے پڑھا تھا۔ اسی طرح مراد بلوچ اور شائستہ بانو (سہتی) کا بھی بچپن میں نکاح شرعی ہو چکا تھا۔ بلوغت کے بعد ہیر کی روانگی کے لئے موجدار خان (موجو رانجھا) رانجھا' مراد عباس (مراد بلوچ) اور اس کا والد سلمان خاں اور مراد بلوچ کا خالو والیدار خان جنجوعہ و دیگر شرفاہ ہیر کی روانگی کے لئے جب کوٹلی باقر شاہ پہنچے تو قضا الٰہی سے چوچک فوت ہو گیا اور روانگی کی بات طے نہ ہو سکی اور یہ لوگ بعد چالیسویں کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اس کے بعد ہیر کی جاگیر کا مختار عام قادر خاں کھیڑا (کیدو سیال) کو بنایا گیا۔ اس نے اپنی ہمشیرہ حقیقی ملائکہ خاتون (ملکی) سے ساز باز کر کے چنیوٹ ریاست کے ایک قاضی نور الدین نے پڑھا ہیر کے بچپن کے نکاح کو نسخ کرا کے نکاح سابقہ کا فتویٰ لے کر اپنے حقیقی بھتیجے شیدے خان کھیڑا (سیدا کھیڑا) بغیر ایجاب و قبول ہیر کا نکاح کرادیا جو قاضی نورالدین نے پڑھا۔ اسی طرح مراد عباس بلوچ کی منکوحہ شائستہ بانو کی روانگی پرانی رنجش کی بنا پر رکی ہوئی تھی۔ عجائب خان کھیڑا (آجو کھیڑا) مراد بلوچ کی ایک خالہ زاد کا رشتہ شیدے خان کھیڑا کے لیے مانگتا تھا جو بلوچ برادری کو نامنظور تھا۔ شیدے خان رنڈوا تھا اور ۵-۶ بچوں کا باپ بھی تھا اور عمر بھی ۵۰-۶۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ اب اگر مراد بلوچ اپنی حکمت عملی سے اپنی منکوحہ شائستہ بانو اور رانجھے کی منکوحہ ہیر کو اپنی چھاتی کے زور پر کھیڑوں کے چنگل سے آزاد کرا کے لے گیا تو یہ اوھالا' کیسے سمجھا جائے! یہ تو وارث شاہ اور دیگر شاعروں کے ہاتھ کی صفائی ہے کہ انہوں نے ایک سنجیدہ گھریلو معاملے کو یکدم رومانوی مسئلہ بنا دیا۔

ہیر کی شیدے خاں کھیڑا سے شادی کے بعد قادر خان نے موجدار خان کو اطلاع کر دی جسے سنتے ہی وہ شرمندگی کا مارا فوت ہوگیا۔ دیدو خان (دھیدو رانجھا) کی ماں بھی اسی غم میں گھل کر کوئی ایک ماہ بعد فوتیدگی موجدار خان مرگئی۔ بھائیوں کی بن آئی اور انہوں نے قاضی شہر اور محکمہ مال کے افسروں سے مل ملا کر اچھی زمین اپنے نام اور بنجر زمین رانجھے کے نام لگوادی۔ مراد بلوچ نے اس خوف سے کہ مبادا کہ اس کے بھائی اسے (رانجھا) قتل نہ کردیں دیدو خان کو اپنے ہمراہ ڈیرہ ہیبت خان لے گیا اور اس کی زمین جدی کاردار کے حوالہ کردی۔ رانجھا کبھی بھی جھنگ نہیں گیا اور نہ ہی وہ کبھی بھی چوچک خان کی بھینسوں کا چرواہا رہا۔ وہ ہیر کو رنگپور سے لے جانے تک ڈیرہ ہیبت خان میں ہی رہا۔ ڈیرہ ہیبت خان کے قریب ہی جانب شمال مشرق رنگپور آباد ہے۔

اس عرصہ میں رانجھا کا پریشان حال رہنا ایک قدرتی امر تھا۔ ماں باپ کی فوتیدگی اور بھائیوں کے ناروا سلوک نے اسے ادھموا کردیا تھا۔ شیدے خان کی ہیر سے شادی کا دعوت نامہ مراد بلوچ کو کوئی ایک ماہ پیشتر مل چکا تھا۔ شائستہ بانو کی طرف سے بھی اسے ایک خفیہ رقعہ ملا جس میں اس نے اپنے بھائی کی ہیر کے ساتھ غیر شرعی شادی کی تاریخ کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ ہیر کا اصلی شوہر تو دیدوخان رانجھا ہے۔ اس لئے جیسے بھی ہوسکے یہ حق حقدار کو ملنا چاہیے اور اس کے لئے وہ اسے رنگ پور کے کلا باغ میں ملے تاکہ باہمی مشورہ سے ہیر کو کسی طریقے سے شیدا کھیڑا کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔ چنانچہ مراد بلوچ خفیہ طور پر شائستہ بانو کو اس کے باغ میں ملا اور طے پایا کہ ہیر کے رنگ پور آنے سے پیشتر وہ اپنے دو۔ چار سو کے قریب ہتھیاروں سے لیس نوجوان بلوچ شکار کے بہانے رنگ پور کے بیلہ میں بھیج دے گا اور جب ہیر رنگ پور میں بیاہی آئے تو رواج کے

مطابق شائستہ بانو ہیر کو شب عروسی منانے سے پہلے دیدو خان جوگی کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوگی اور پھر یہاں سے وہ مراد بلوچ کے ساتھ معہ ہیر کلا پٹھاناں کو لعل کان ڈھڈی کے پاس چلے جائیں گے۔ کلا پٹھاناں دیدو خان رانجھا کی بھاوج بنگہ خاتون کا میکہ شہر تھا۔ اس منصوبہ کو عملی رنگ دینے کے لئے مراد بلوچ دیدو خان کو ساتھ لے کر ٹلہ بالناتھ پہنچا اور اس سے رانجھا کو جوگی بنوا کر اسے کلا باغ رنگپور میں بطور جوگی' شائستہ بانو نے بٹھا دیا اور وہ دھونی لگا کر بیٹھ گیا اور اسے آٹھ دس مصنوعی چیلے بھی دے دئے گئے۔

منصوبہ کے مطابق جب ہیر رنگ پور میں آئی اور شائستہ بانو اسے جوگی کے پاس شب عروسی منانے سے پیشتر لائی تو وہاں سے مراد بلوچ اپنی منکوحہ شائستہ کو اور اپنے پھوپھی زاد دیدو خان اور اس کی منکوحہ ہیر کو اپنے بلوچ دوستوں کی پناہ میں دریائے چناب کے رنگ پور پتن کے راستے کلا پٹھاناں کو چلے گئے۔ یہ کوئی آدھی رات کا واقعہ ہے۔ ادھر کھیڑے تھکے ماندے اور شراب سے مدہوش جب ہوش میں آئے تو شائستہ بانو اور ہیر کو نہ پاکر باولے ہوئے کیونکہ کلا باغ میں جوگی بھی غائب تھا۔

جب پتن کے ملاحوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ دو چار سو ہتھیار بند سواروں کے ہمراہ دو عورتیں بھی تھیں تو شیدے خان ۵-۶ ہتھیار بند جوانوں کی معیت میں ان کے پیچھے دوڑ پڑے اور مراد بلوچ کو راجہ عدلی' کوٹ قبولہ کی جو میں جالیا اور معرکہ آرائی شروع ہو گئی اور جوانوں کا قتل شروع ہو گیا۔

مراد بلوچ نے اپنے منصوبے سے رانجھو' جنجوعوں اور ڈھڈیوں کو آگاہ کیا ہوا تھا وہ بھی اس جنگ میں شامل ہوگئے۔ رانجھوں کی کمان ۔لنگہ خاتون کر رہی تھی اور رانجھا کی دو غیر حقیقی بہنیں .بنگہ خاتون کی مددگار تھیں۔ اس عرصہ میں ہیر اور

شائستہ بانو پر کھیڑوں نے قبضہ کرلیا تھا لیکن بنگہ خاتون بھو کی شیرنی کی طرح کھیڑوں کے نرغے کو توڑتی ہوئی ہیر کو اور اس کی مدد گاروں نے سہتی کو اپنے قبضہ میں کر کے اپنے اپنے گھوڑوں پر لادا اور کلا پٹھاناں کو بھاگ گئیں۔ اس عرصہ میں ہیر نے شیدے خان کھیڑے کو بہت بری طرح زخمی کیا کہ وہ میدان میں پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ رانجھا جوگی نے بھی جوانمردی کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ جب راجہ عدلی کو اس معرکہ آرائی کا پتہ چلا تو اس نے فریقین کو بذریعہ اپنی فوج اپنی عدالت میں بلوا کر ہیر کی زوجیت کے فیصلے کے لئے اپنے قاضی کے پاس بھیج دیا۔ قاضی کا نام خیرالدین تھا۔

قادر خان کے جاسوسوں نے اسے حالات حاضرہ کی اطلاع کردی جس پر اس نے قاضی نورالدین سے ایک سفارشی چٹھی بنام قاضی خیرالدین بھجوائی کیونکہ قاضی خیرالدین قاضی نورالدین کا بھائی تھا۔ قاضی خیر الدین نے ہیر کا بیان تو سنا مگر اسے قلم بند نہ کیا اور قاضی نورالدین کے فتویٰ کے مطابق نکاح ہیر کو موثر گردانتے ہوئے ہیر کو کھیڑوں کے سپرد کردیا۔

اس فیصلہ کے خلاف مراد بلوچ نے راجہ عدلی کی عدالت میں اپیل دائر کردی جس پر راجہ نے دیپالپور کے قاضی القضاۃ شفیع الدین کو اس اپیل کا فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کردیا اور تا فیصلہ ثانی ہیر کو شاہی مہمان خانہ میں معہ اس کے ہمراہیوں کے رکھا۔ قاضی شفیع الدین نے اس بچپنے کے نکاح کے گواہان کو فیصلے کی تاریخ سے بروقت آگاہ کیا اور حاضر عدالت ہونے کے لئے پابند کیا گیا۔ مقررہ تاریخ پر محرم الحرام ۸۸۴ ہجری کو سوائے قادر خان کے باقی سب حاضر عدالت ہوئے اور سب نے ہیر کو حق پر قائم ہونے کی گواہی دی جس پر قاضی شفیع الدین نے قاضی نورالدین کے فتوے فسخ نکاح کو غیر موثر قرار دیتے ہوئے ہیر کو مراد بلوچ کے حوالہ

کردیا اور کھیڑوں کو حکم دیا کہ وہ سہ پہر سے پہلے پہلے راجہ عدلی کی جوہ سے باہر چلے جائیں ورنہ ان کو گرفتار کیا جائے گا۔ قاضی نے اپنے فیصلہ میں یہ بھی لکھا کہ اگر ہیر کو اپنی حفاظت کے لیے فوجی امداد کی ضرورت محسوس ہو تو وہ لے سکتی ہے۔ اس فیصلہ کے بعد لعل خان ڈھڈی نے رانجھوں اور بلوچوں کو اپنے مہمان خاص رکھا اور یہ لوگ ۱۱ر محرم تک کالا پٹھاناں میں ہی رہے۔

اس عرصہ میں رانجھا جوگی اپنے گورو بھائی ناتھ دشوا داس کے پاس بحیثیت جوگی رہا۔ ۱۲ر محرم الحرام کو مراد بلوچ نے رانجھا جوگی کو تخت ہزارہ جانے کے لیے کہا۔ رانجھا جوگی نے جواباً" کہا کہ اگرچہ ہیر کے لیے مصنوعی جوگی بان تھا لیکن اب اسے حق کی معرفت حاصل ہوگئی ہے اس لئے وہ گرہستی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ ہیر کو میری طرف سے حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بہتری کے لئے جو راستہ اختیار کرلے کرسکتی ہے۔ البتہ اگر وہ جوگن بن کر اس کے ساتھ وقت گزار سکتی ہو تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔ اس کی بھنک ہیر کے کانوں تک جب پہنچی تو وہ حالت نماز میں ہی اللہ تعالیٰ کو پیاری ہوگئی اور ادھر رانجھا کو حق نے اپنے پاس بلالیا اور یہ جوڑا جسم کی خوشبو سے محروم اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ چنانچہ صندل کی لکڑی کا ایک دوخانہ کجاوہ نما صندوق تیار کیا گیا اور علماء کرام کے فتویٰ مطابق یہ جس حالت میں تھے شہید حق سمجھ کر صندوق میں رکھ کر تیز رفتار ڈاچی پر لاد کر ۱۲ر محرم ۸۸۴ھ کو کالا پٹھاناں سے رخصت ہوئے اور انہیں ۱۴ر محرم ۸۸۴ھ کو تخت ہزارہ کے دیرینہ شہر میں ایک ہی قبر میں دفن کردیا گیا۔ اس وقت ہیر کی عمر مطابق تاریخ پیدائش ار رمضان ۸۶۸ ہجری تقریباً" ۲۱-۲۰ سال اور رانجھا کی عمر مطابق تاریخ پیدائش ۲۷ر جمادی الثانی ۸۶۰ ہجری کوئی ۲۴-۲۵ سال تھی۔

ہم نے وارث شاہ کی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے "سوانحعمری

وارث شاہ" ۱۲۲۰ء مصنفہ سید قاسم شاہ سے استفادہ کیا ہے اور خاص خاص حوالہ جات کی فوٹو سٹیٹ نقول بطور ضمیمہ اس کتاب میں شامل کردی ہیں۔ کرداروں کے ٹھکانوں پر جو مشہور دیرینہ اور جدید عمارتیں تھیں ان کی سکیل ڈرائینگیں بنا کر ان کی فوٹو سٹیٹ نقول شامل کتاب کردی گئی ہیں۔ ان مقامات میں تحت ہزارہ، جھنگ، ٹلہ بالناتھ اور کوٹ قبولہ شامل ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمیں رنگپور کھیڑا اور ڈیرہ ہیبت خان میں کوئی ایسی عمارت نظر نہیں آئی جس کا نقشہ بنایا جاتا۔ اسی طرح ہیر وارث شاہ کے باقی کرداروں کی زندگی کے حالات و واقعات ہم نے مراد بلوچ کی "تاریخ ہیر" ۸۸۶ھ سے لیے ہیں اور خاص خاص واقعات کی فوٹو سٹیٹ نقول اس کتاب میں بطور ضمیمہ شامل کردی گئی ہیں۔

ہماری یہ ناچیز بلکہ ناچیز کوشش کوئی دو چار دن کا کام نہیں بلکہ اس کام کی تکمیل کے لئے ہم نے اپنی زندگی کے چالیس پچاس سال قربان کردئے ہیں اور دنیا کی تمام دلچسپیوں سے کنارہ کش کرکے بڑے ہی محدود وسائل میں صدیوں پہلے کی ہیر کی کہانی کی پڑچول کرکے مختلف مواقع میں پیش کی گئی ہیر کی تصویر اور حقیقی ہیر کو موجودہ شکل ہیر حقیقت میں پیش کررہے ہیں۔

اس تحقیق کا مواد اکٹھا کرنے کے لیے ہمیں کئی پاپڑ بیلنے پڑے کیونکہ یہ تو خود وارث شاہ نے اور نہ ہی کسی اور ہیر کے شاعر یا ادیب نے مراد بلوچ کا ٹھکانہ اور قاضی و راجہ عدلی کے ناموں کی نشاندہی کی ہے

کتابیات

پنجابی

سی حرفی قادر یار

سید وارث شاہ دی جیون کتاب — سبط الحسن ضیغم

سسی وارث شاہ

کھوج شمارہ ۲۷/۲۶ (۱۹۹۲)

جنگ ہند پنجاب

وارث شاہ بارے ایک گویڑ — شریف کنجاہی

کھوج

نادر شاہ دی وار

سید وارث شاہ — حمید اللہ ہاشمی

وارث شاہ — وارث شاہ نمبر' ملتان

پریم کہانی — باوا بدھ سنگھ

نقوش (لاہور) — لاہور نمبر

پنجابی شاعراں دا تذکرہ — کشتہ

پنجابی دنیا (گورمکھی) — وارث نمبر

دیباچہ ہیر وارث شاہ — موہن سنگھ دیوانہ

پنجاب دا نواں روپ رنگ — میجر اسحاق

تاریخ گوجرانوالہ — منشی گوپال داس

تاریخ گوجرانوالہ — مرزا محمد اعظم بیگ

تاریخ گجرات	مرزا محمد اعظم بیگ
مآثر لاہور	سید ہاشمی فرید آبادی
	ادارہ ثقافت اسلامیہ
مختصر تاریخ پنجاب	مفتی باقر
تاریخ پنجاب	رائے بہادر کنہیا لال
تاریخ لاہور	رائے بہادر کنہیا لال
گلشن پنجاب (محمد مصطفیٰ)	مخطوطہ پبلک لائبریری
واقعات درانی	
معشوقہ پنجاب	قاضی فضل حق
پنجاب مغلوں کے عہد زوال میں	عزیز چودھری
اردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند
پنجاب رنگ	شفیع عقیل
پنجابی قصے فارسی زبان میں	ڈاکٹر محمد باقر
پنجاب ادب	محمد سرور
پنجابی ادب کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر احمد حسین قلعہ داری
تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند	مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور
	دائرۃ المعارف اسلامیہ لاہور
تاریخ روسائے پنجاب	مترجم بھگوان داس
تاریخ پنجاب	محمد لطیف
یادگار وارث	پروفیسر ضیا محمد
مقامات وارث	سید علی عباس جلالپوری
شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوب	خلیق نظامی، دہلی

تحقیقات چشتی	نور احمد چشتی
تاریخ مخزن پنجاب	مفتی غلام سرور
حکایات پنجاب	
قصور ؟ ؟	
تاریخ پنجاب	بوٹے شاہ
	مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ورق ۱۸۳ الف
عمدۃ التواریخ	سوہن لعل سوری
وارث شاہ (عہد اور شاعری)	عذرا وقار
خلاصۃ التواریخ	سبحان رائے
	ترجمہ ناظر حسن زیدی
اولیائے قصور	مولوی محمد شفیع

فارسی

چہار باغ	گنیش داس
واقعات درانی	عبدالکریم
عبرت نامہ	مفتی علی الدین
بیان واقع	عبدالکریم
خزانہ عامرہ	قلی علی آزاد
محاربات سلطانیہ درانیہ با سکھاں وغیرہ	عبدالکریم
سیر المتاخرین	غلام حسین طباطبائی
مجمل التاریخ	ابوالحسن بن محمد امین

انذرام
اموال آدینہ بیگ
پنجاب یونیورسٹی۔ ورق ۱۲۱ب ۱۲۲الف
تاریخ جہاں ستائے نادری

مطبوعہ تہران
بدائع، وصنائع، محطوطہ
روٹوگراف
پنجاب یونیورسٹی لائبریری
ورق ۵۳-الف
محمد مہدی

Nadir Shah	by L.Lockhart
The History of India	by Eliot and Dowson.
Later Moghuls	by Willium Invine
Ancient Punjab	by Budha Prakash.
Later Moghul History of the Punjab	by H.R. Gupta.
Annexatim of the Punjab	by Maj. Craos Bell.
Sikhs of the Punjab	by Sarfraz Khwaja.
Ahmed Shah Durrani	bu Ganda Singh.
Ramantic Tales from the Punjab	by Chavbs Swynnertan.
The Punjab as a Sovreign State	Gulshan lal Chopra.
A History of India (Second Volume)	Moxon Publication.
Canbridge Histary of India.	
An Intorduction to Punjab Literature	by M.S. Dinana.
Bulliton of the Druintul Studies	by Gearge Greisan
Adventure of Hir and Ranjha	by C.F. Usbarn
Punjab Literature	by Sene - bryakon
A Glossory of Punjab Tribes	by Derzil Ibbertson.
A History of the Sitehs	by Khushvant Singh.
	by J.D. Cunmigham
The Peoples of Pakistan	Y.U.Gankousky

Kitabull-Hind	Al-Biruni.
Extracts from the Dist. Gazateen of Punjab.	
Chranides of Gujrat-	by Eliot
History of Civilization	W,Durrant.